احیائے اسلام اور امن عالم کا داعی کثیر الاشاعت میگزین

ماہنامہ منہاج القرآن لاہور

جون 2025ء

اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ کے حکم کی حجیت اور اتھارٹی ایک ہے

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا خصوصی خطاب

حج اور قربانی کی روح: تزکیۂ نفس اور خدمتِ خلق

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حکمرانوں کے لیے قابلِ تقلید اُسوہ

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی حیا و بردباری معاشرتی اصلاح کا ذریعہ

شہادتِ امام حسین علیہ السلام کی انفرادیت اور معنویت

تنزیلہ امجد شہید

شازیہ مرتضیٰ شہید

سانحہ ماڈل ٹاؤن کے 11 برس
متاثرین انصاف کے منتظر

محمد عمر صدیق شہید

محمد اقبال شہید

غلام رسول شہید

حکیم صفدر حسین شہید

محمد عاصم حسین شہید

خاور نوید رانجھا شہید

رضوان خان شہید

شہباز مصطفوی شہید

فاؤنڈنگ ممبرز ڈے کے موقع پر تقریب کا انعقاد

منہاج یونیورسٹی کے زیر اہتمام ماحولیاتی تبدیلی کے موضوع پر کانفرنس

علماء جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک کا دورہ منہاج القرآن

احیائے اسلام اور امن عالم کا داعی کثیر الاشاعت میگزین

ماہنامہ منہاج القرآن لاہور

جلد: 39 / شمارہ: 6 / ذوالحج ۱۴۴۶ھ / جون 2025ء

بفیضانِ نظر: قدوۃ الاولیاء شیخ المشائخ حضرت سیدنا طاہر علاؤالدین الگیلانی البغدادی قدس سرہ العزیز

زیرِ سرپرستی: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدظلہ

زیرِ نگرانی: ڈاکٹر حسن محی الدین قادری | ڈاکٹر حسین محی الدین قادری

چیف ایڈیٹر: نور اللہ صدیقی

ایڈیٹر: محمد یوسف

ڈپٹی ایڈیٹر: ابدال احمد میرزا

ایڈیٹوریل بورڈ

محمد رفیق نجم، ڈاکٹر محمد فاروق رانا، عین الحق بغدادی
محمد بلال اُپل، سید علی عباس بخاری، فیصل حسین مشہدی

مجلس مشاورت

خرم نواز گنڈاپور، احمد نواز انجم، جی ایم ملک
محمد جواد حامد، سرفراز احمد خان، منظور حسین قادری
غلام مرتضیٰ علوی، علی عمران، داؤد حسین مشہدی

قلمی معاونین

مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی، محمد شفقت اللہ قادری
ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی
ڈاکٹر ممتاز احمد سدیدی، ڈاکٹر محمد افضل قادری

حسن ترتیب

اداریہ: انصاف میں تاخیر، انصاف کے قتل کے مترادف ہے	چیف ایڈیٹر	5
القرآن: اللہ اور رسول اکرم ﷺ کے حکم کی حجیت اور اتھارٹی ایک ہے	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری	8
الفقہ: فلسفۂ قربانی	مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی	16
حج اور قربانی کی روح: تزکیہ نفس اور خدمتِ خلق	ڈاکٹر فیض اللہ بغدادی	22
حضرت عمر فاروقؓ: حکمرانوں کے لیے قابلِ تقلید اُسوہ	علامہ عمر تلمسانی	31
حضرت عثمان غنیؓ کی حیا و بردباری: معاشرتی اصلاح کا ذریعہ	ڈاکٹر محمد اظہر عباسی	40
شہادتِ امام حسینؑ کی انفرادیت اور معنویت	ڈاکٹر حافظ ظہیر احمد الاسنادی	48
سانحہ ماڈل ٹاؤن کے 11 برس	نعیم الدین چودھری ایڈووکیٹ	56
انسانی مقصدِ حیات اور فلسفہ مزاحمت	ڈاکٹر حسین محی الدین قادری	64
فاؤنڈنگ ممبرز ڈے کے موقع پر تقریب کا انعقاد	رپورٹ	73
علماء جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک کا دورۂ منہاج القرآن	رپورٹ	76
منہاج یونیورسٹی کے زیرِاہتمام ماحولیاتی تبدیلی کے موضوع پر کانفرنس (رپورٹ)		79

کمپیوٹر آپریٹر: محمد اشفاق انجم
گرافکس: عبدالسلام
خطاطی: محمد اکرم قادری
عکاسی: قاضی محمود الاسلام

قیمت فی شمارہ: 60 روپے | سالانہ خریداری: 700 روپے

ملک بھر کے تعلیمی اداروں اور لائبریریوں کیلئے منظور شدہ

www.minhaj.info
www.facebook.com/minhajulquran
email:mqmujallah@gmail.com (مجلّہ آفس و سالانہ خریداران)
minhaj.membership@gmail.com (نظامت ممبرشپ/رفقاء)
smdfa@minhaj.org (بیرون ملک رفقاء)

انتباہ! مجلّہ منہاج القرآن میں آنے والے جملہ پرائیویٹ اشتہار خلوص نیت سے شائع کئے جاتے ہیں ادارہ کی کسی کاروبار میں شراکت ہے اور نہ ہی ادارہ فریقین کے درمیان کسی بھی قسم کے لین دین کا ذمہ دار ہوگا۔

بدل اشتراک: مشرق وسطی جنوب مشرقی ایشیاء، یورپ، افریقہ، آسٹریلیا، کینیڈا، مشرق بعید جنوبی امریکہ و ریاستہائے متحدہ امریکہ 30 امریکی ڈالر سالانہ

ترسیل زر کا پتہ: اکاؤنٹ نمبر 02930103644000 میزان بینک شالیمار لنک روڈ لاہور پاکستان

ناشر: محمد اشرف قادری، مطبع: منہاج القرآن پرنٹرز 365 ایم ماڈل ٹاؤن لاہور UAN:042-111-140-140 Ext: 128

حمدِ باری تعالیٰ

زمانے بھر کے سب علم و ہنر تیرے عطا کردہ
مرا حسنِ نظر، ذوقِ نظر، تیرے عطا کردہ

مرے جذبوں کو ساری وسعتیں تو نے عطا کی ہیں
مرے احساس کے شام و سحر تیرے عطا کردہ

ہمیں دیتا ہے تو ہی حوصلہ منزل کو پانے کا
طلب منزل کی اور عزمِ سفر تیرے عطا کردہ

میرے دامن میں نہیں محرومیاں یکسر، مگر اب ہیں
متاعِ نعت کے لعل و گہر تیرے عطا کردہ

مدینے کی طرف اڑتا چلا جاتا ہوں ہر لحظہ
میرا ذوقِ سفر، زادِ سفر، تیرے عطا کردہ

یہ لفظوں کے گہر، یہ آرزوؤں کے حسین خاکے
دعاؤں میں جو آتے ہیں نظر، تیرے عطا کردہ

یہ خالدؔ کچھ نہیں ہے، اسکی ہستی ہیچ ہے یارب
یہ گھر اس کا، یہ سارے بام و در تیرے عطا کردہ

﴿خالدؔ شفیق﴾

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

ابتدا کی خیر ہو اور انتہا کی خیر ہو
”ہر قدم پر عاشقانِ مصطفیٰ کی خیر ہو“

جو ہوا میلادِ محبوبِ خدا سے فیض یاب
اس مبارک شہرِ مکہ کی فضا کی خیر ہو

جس کے چھونے سے ملے مردہ دلوں کو زندگی
شہرِ طیبہ کی ہوائے جاں فزا کی خیر ہو

آؤ ان کی آل کے در پر چلیں بن کر گدا
خیر بھی دیتے ہیں کہتے ہیں گدا کی خیر ہو

ربِ کعبہ! ظلمِ اہلِ کفر حد سے بڑھ چکا
ہے تجھی سے اب دعا اہلِ غزا کی خیر ہو

کر رہے ہیں جو فدا جانیں نبی کے نام پر
ان کی جرأت اور حمیت اور وفا کی خیر ہو

یا الٰہی جس بھی خطے میں ہے دنیا کے مقیم
ہر جگہ پر امتِ خیرالوریٰ کی خیر ہو

جن سے ہمذانی جہاں کو نعت کا ورثہ ملا
کعبؓ و حسانؓ و بوصیریؒ اور رضاؒ کی خیر ہو

﴿انجینئر اشفاق حسین ہمذانی﴾

اداریہ

انصاف میں تاخیر انصاف کے قتل کے مترادف ہے

عدل کے بغیر کوئی بھی معاشرہ صحت مند انداز سے نہ تو پنپ سکتا ہے اور نہ ہی اس معاشرے میں انسانی حقوق کی کماحقہ ادائیگی کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ انسانی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ کوئی معاشرہ اور حکومت نظامِ عدل وانصاف کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ اس لیے دینِ اسلام نے انفرادی اور اجتماعی سطح پر اسے سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ حتیٰ کہ اسے حکومت کے اولین فرائض میں شمار کیا ہے۔ اسلامی ریاست کے ہر شہری کو خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، حاکم ہو یا محکوم، امیر ہو یا غریب، بڑا ہو یا چھوٹا، انصاف مہیا کرنا اور اس کے حقوق کا تحفظ کرنا، اسلامی حکومت کا کوئی احسان نہیں بلکہ اس کا بنیادی فرض ہے۔

قرآن حکیم میں بھی اکثر مقامات پر قیامِ عدل پر زور دیا گیا ہے۔ اللہ رب العزت نے فرمایا: ''فرما دیجیے کہ میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے۔'' اسی طرح سورہ الانعام میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور ناپ تول کو انصاف سے پورا کرو''۔ سورہ الحدید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: '' بے شک ہم نے اپنے رسول نشانیوں کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا تاکہ لوگ انصاف قائم کریں''۔ آپ ﷺ کے عطا کردہ انسانی حقوق کے تصور سے عدل کی ان روایات نے بال و پر حاصل کئے اور ان کی موجودگی میں اسلامی معاشرے میں قانون کے نفاذ اور حقوق کی ادائیگی میں ذرہ مشکل پیش نہ آئی۔ عہد نبوی ﷺ میں عدل و انصاف کی فراہمی کا یہ معیار تھا کہ کوئی فرد یا طبقہ ناانصافی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک موقع پر جب آپ ﷺ نے ایک معزز خاندان کی عورت کو چوری پر سزا دی تو اس کی سفارش کرنے والوں کی سفارش رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''خدا کی قسم! اگر فاطمہ بنتِ محمد چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔'' خلفائے راشدین کے دور میں بھی انصاف کی فراہمی کی روایت آگے بڑھتی رہی، جس کے بے شمار نظائر موجود ہیں۔ اسلام کے نظامِ عدل میں مجرم کے حسب نسب کو دیکھے بغیر اس کے جرم کے مطابق اُسے سزا دی جاتی تھی، یہی وہ وصف تھا جس کی وجہ سے اسلام شرق تا غرب پھیلتا چلا گیا۔

انصاف اور منصف کے بارے میں احادیث مبارکہ موجود ہیں جس سے انصاف کی فراہمی کی ناگزیریت سامنے آتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''انصاف کرنے والے اللہ تعالیٰ کے نزدیک نور کے منبروں پر ہوں گے، جو اپنے فیصلوں اور اپنے اہل و عیال کے درمیان انصاف کرتے ہیں۔'' ایک اور موقع پر حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ عدل و انصاف قائم کرنے والے حکمرانوں کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے گا، جس دن اس کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا''۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی فیصلہ کرے تو انصاف سے کام لے، اگرچہ وہ اپنے قریبی رشتہ دار کے خلاف ہو۔'' حدیث مبارکہ ہے: ''جب امت میں انصاف قائم ہو جائے تو وہ فلاح پاتی ہے اور جب ظلم پھیل جائے تو وہ ہلاک ہو جاتی ہے۔'' حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''ظلم سے بچو، کیونکہ ظلم قیامت کے دن اندھیروں کا سبب ہوگا''۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: ''مظلوم کی دعا سے بچو، کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا''۔ حکمرانوں کو عدل و انصاف نہ کرنے پر وعید سناتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''قیامت کے دن سب سے سخت عذاب ظالم حکمران کو ہوگا۔''

بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ بھی نظامِ انصاف کے ساتھ منسلک ہے۔ جن ملکوں اور معاشروں میں بلا روک ٹوک انصاف دستیاب ہوتا ہے، وہاں ظلم، بے یقینی اور عدمِ تحفظ جیسے معاشرتی عوارض جڑ نہیں پکڑتے۔ انصاف کی فراہمی حاکمینِ وقت کا صوابدیدی اختیار نہیں ہے بلکہ یہ قرآن و سنت کی طرف سے ٹھہرایا جانے والا ایک ایسا مقدس فریضہ ہے جس سے انحراف قابلِ گرفت جرم ہے۔ جب تک اُمتِ محمدیہ ﷺ میں انصاف کی فراہمی اولین ترجیح تھی اسلام کی سرحدیں پھیل رہی تھیں، مظلوم طبقات اسلامی ریاست کے اندر خود کو محفوظ و مامون سمجھتے تھے۔ اگر ہم اپنے کمال سے زوال کے سفر کو مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو وہ یوں ہے کہ جب سے اُمت نے انصاف کا دامن چھوڑا وسائل اور افرادی قوت کی فراوانی کے باوجود مغلوب ہے۔

مذکورہ بالا قرآنی آیات اور احادیثِ مبارکہ کے مطالعہ کے بعد ہم بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ اگر اپنی آزادی، اقتدارِ اعلیٰ، قومی وقار کا تحفظ کرنا ہے تو انصاف کی فراہمی کو اپنی اولین ترجیح بنائیں۔ جب کسی مظلوم کو انصاف نہیں ملتا تو اُس کا ریاست پر اعتماد مجروح ہوتا ہے۔ بالادست طبقات ظلم کرنے میں اور بھی بے خوف ہو جاتے ہیں۔ طاقت کا توازن بگڑ جاتا ہے اور ایسے معاشروں میں خوشحالی نہیں انارکی ہوتی ہے اور انارکی کے ماحول میں ترقی و خوشحالی کا کوئی بھی ایجنڈا کارگر ثابت نہیں ہوتا۔

اسلام قانون میں عدل و انصاف کے حوالے سے تمام لوگ یکساں ہیں اور اسلام اس معاملہ میں کسی کے حسب و نسب اور جاہ و مرتبہ کو نہیں دیکھتا۔ عامۃ الناس تو ایک طرف رہے، سربراہِ مملکت اور خلیفہ

وقت کو بھی کوئی امتیاز اور استثناء حاصل نہیں۔ اس کے خلاف کوئی دعویٰ دائر ہوتا ہے تو اسے بھی عدالت کے کٹہرے میں مدعی کے برابر کھڑا ہونا ہوگا۔ اگر مدعا علیہ غیر مسلم اور قاضی کا دشمن بھی ہے تو محض اس وجہ سے اس کے ساتھ ناانصافی نہیں کی جاسکتی کہ وہ غیر مسلم یا دشمن ہے۔ اسلام کے قانون عدل میں یہ بات بھی داخل ہے کہ سربراہِ حکومت، گورنروں، وزراء، اعلیٰ حکام اور عامۃ الناس سب کے لیے ایک ہی قانون اور ایک ہی نظامِ عدالت ہے۔ کسی کے لیے کوئی قانونی امتیاز نہیں۔ کوئی بڑے سے بڑا قانون کی گرفت سے مستثنیٰ نہیں۔ عدل وانصاف کے معاملے میں اسلامی ریاست کے خلفاء اور قاضیوں نے جو مثالیں قائم کی ہیں۔ ان کی نظیر دنیا کے کسی مذہب، قانون اور آئین میں نہیں پائی جاتی۔

سانحہ ماڈل ٹاؤن پاکستان کی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ جس کی پاکستان کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ مورخہ 17 جون 2025ء کو شہداء سانحہ ماڈل ٹاؤن لاہور کی گیارہویں برسی ہے لیکن سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین اور شہداء کے لواحقین 11 سال سے انسدادِ دہشت گردی عدالت لاہور سے، لاہور ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ آف پاکستان تک حصولِ انصاف کے لیے مسلسل قانونی چارہ جوئی کر رہے ہیں لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ 11 سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین انصاف سے محروم ہیں۔

پاکستان عوامی تحریک اور تحریک منہاج القرآن کے اندرون و بیرون ملک مقیم ہزار ہا کارکنان شہدائے ماڈل ٹاؤن کے ورثاء کو اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی انصاف نہ ملنے پر شدید تکلیف سے دوچار ہیں۔ ملکی تاریخ کا یہ وہ واحد سانحہ ہے جسے پوری قوم نے براہِ راست ٹیلی ویژن کی سکرین پر دیکھا۔ ریاستی ادارہ پولیس جس طریقے سے نہتے اور پُرامن لوگوں پر گولیاں برسا رہا تھا، بوڑھوں، بچوں، خواتین کو بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنا رہا تھا، وہ تشدد کی تاریخ کا بدترین واقعہ ہے۔ ظلم کا ایک واقعہ تو یہ ہے کہ کسی نے ظلم کرنے والوں کا ہاتھ نہیں روکا اور دوسرا ظلم یہ تھا کہ ظلم کے واقعے کی رپورٹ درج کروانے سے بزور طاقت روکا گیا اور تیسرا المیہ یہ ہے کہ عدالتوں سے بھی شہدائے ماڈل ٹاؤن کے ورثاء کو آج تک انصاف نہیں مل سکا۔ یہ طرزِ عمل انصاف کا قتل ہے۔ حکومت، قانون نافذ کرنے والے ادارے اور نظامِ عدل کی یہ آئینی، و قانونی اور انسانی و اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ مظلوموں کو انصاف دے اور انصاف کرتے وقت طاقتوروں کے خوف کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ یہ آئینی تقاضا ہی نہیں بلکہ اللہ رب العزت کا حکم بھی ہے۔ دعا کرتے ہیں کہ اللہ رب العزت ہمیں عدل وانصاف کی راہ پر گامزن کرے تاکہ ہمارے احوال درست ہو سکیں۔

(چیف ایڈیٹر: نوراللہ صدیقی)

اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی حجیت اور اتھارٹی ایک ہے

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا ایمان افروز خطاب

حصہ: ۱۴

ترتیب وتدوین: محمد یوسف منہاجین

حدیث وسنت کو حجت سمجھے بغیر اور ان کی مدد لیے بغیر دین، عقائد، احکام اور مسائل کی تشریح وتعبیر صرف قرآن مجید سے کرنا، ایک فتنہ اور گمراہی ہے، جو دین اور قرآن کے نام پر امت میں پھیلایا گیا۔ زیرِ نظر مضمون کے گزشتہ حصوں میں اس فتنہ کا قلع قمع کرنے اور حدیث وسنت کی حجیت کو ثابت کرنے کے لیے قرآن مجید کی آیات اور احادیث نبویہ کی روشنی میں متعدد دلائل بیان کیے گئے۔ آیئے! حدیث وسنت کی حجیت کے باب میں مزید قرآنی دلائل کا ایک اور تناظر سے مطالعہ کرتے ہیں:

قرآن مجید نے فرمانِ الٰہی اور فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتھارٹی وحجت ہونے اور حکم کے اعتبار سے حقیقت میں ان دونوں کے ایک ہی ہونے کو بیان کرنے کے لیے یہ اسلوب بھی اختیار کیا ہے کہ قرآن مجید میں مذکور وہ احکام جن میں اللہ اور اللہ کے رسول کا ذکر اکٹھا آیا ہے، وہاں تثنیہ (دو) کی ضمیر بیان نہیں کی بلکہ واحد کی ضمیر استعمال کی ہے۔

عامۃ الناس اس بات کو اس مثال سے بخوبی سمجھ جائیں گے کہ ہر زبان کے اپنے کچھ اصول وقواعد ہوتے ہیں۔ مثلاً: اردو زبان میں ضمیر دو طرح کی ہوتی ہے: واحد اور جمع۔ ایک شخص کی بات ہے تو اس کے لیے کہیں گئے کہ 'اس شخص نے یہ کہا، وہ کھا رہا ہے، وہ بیٹھا ہے، وہ آرہا ہے، وہ چل رہا ہے۔' یعنی ایک شخص کے لیے لفظ ''وہ'' اور ''اس'' استعمال کیا گیا ہے۔ اگر ایک سے زائد افراد ہیں، خواہ دو آدمی ہوں یا سو یا دس ہزار یا لاکھوں تو ان کے لیے جمع کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ ان کے لیے کہیں گے کہ 'وہ

(خطاب نمبر: Ci-36)، (تاریخ: 26 دسمبر 2013ء)(مقام: کینیڈا)

آرہے ہیں، وہ بیٹھے ہیں، وہ کھا رہے ہیں، اُن سب نے ہاتھ اٹھائے، اُنہوں نے نعرہ لگایا'، ان کثیر افراد کے لیے یوں نہیں کہیں گے کہ ' اُس نے نعرہ لگایا، وہ آرہا ہے، وہ بیٹھا ہے۔' ''وہ، ہم، تو، تم، اس، انھوں'' وغیرہ یہ ضمیریں ہیں جو اردو زبان میں استعمال ہوتی ہیں۔ انگریزی زبان میں ان ضمائر کو Pronoun کہتے ہیں۔ مثلاً: He, his, her,you, I, they, them وغیرہ۔ یہاں بھی ان ضمیروں کا استعمال اردو ہی کی طرح ہے۔

اسی طرح یہ ضمائر عربی زبان میں بھی ہیں مگر وہاں ان کا طریقہ اردو اور انگریزی سے جدا ہے۔ عربی زبان میں بہت زیادہ وسعت ہے، اس لیے اس کی ضمائر بھی وسیع ہیں۔ عربی زبان میں واحد کے لیے الگ ضمیر، تثنیہ (دو) کے لیے الگ ضمیر اور دو سے زیادہ یعنی جمع کے لیے الگ ضمیر ہے۔ اس اصولی بات کو سمجھنے کے بعد اب آیئے ہم زیرِ بحث موضوع کے تناظر میں قرآن مجید کی آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں کئی مقامات ایسے ہیں جہاں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا اکٹھا ذکر آیا ہے مگر کسی حکم کو بیان کرتے ہوئے دونوں کے لیے واحد کی ضمیر استعمال کی گئی ہے۔ اس اسلوب کو اختیار کرنے کا مقصود یہ تھا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے اندر دوئی کے تصور کو بھی ختم کر دیا جائے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ بے شک اللہ اور رسول ﷺ ذاتیں دو ہیں مگر ان کا حکم ایک ہے۔۔۔ ان کے فرمان کا معنی ایک ہے۔۔۔ ان کے حکم کی حجیت اور اتھارٹی ایک ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۔ (النساء، ۴: ۱۴)

''اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی نافرمانی کرے اور اس کی حدود سے تجاوز کرے، اسے وہ دوزخ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے ذلّت انگیز عذاب ہے۔''

اس آیت میں اللہ اور اللہ کے رسول دونوں کی نافرمانی پر سزا کی بات ہو رہی ہے، اس لیے عربی زبان کے قاعدے کے مطابق یہاں تثنیہ کی ضمیر استعمال ہونی چاہیے تھی کہ: وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهُمَا کہ ''جو دونوں کی حدود سے تجاوز کرے، تو پھر اللہ ان کو جہنم میں ڈال دے گا۔'' لیکن یہاں ایسا نہیں کیا گیا بلکہ واحد کی ضمیر استعمال کی گئی اور فرمایا وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ (اور جو اس کی حدود سے تجاوز کرے)۔

قرآن مجید نے اللہ اور رسول ﷺ دو کا ذکر کیا مگر دونوں کی نافرمانی کو ''ان کی'' کی حدود توڑنا قرار دینے کے بجائے ''اس کی'' حدود توڑنا قرار دیا۔ اس اسلوب سے واضح فرما دیا کہ ان

دونوں کا حجت ہونا اور دونوں کی اطاعت و احکام کا وجوب و لزوم اپنی الگ الگ حیثیت کے ساتھ ساتھ آپس میں ضم بھی ہو جاتا ہے۔ جب اللہ اور اس کے رسول کا حکم متعین کرتے ہیں تو وہ دونوں مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔

عربی زبان کا ایک اور قاعدہ ہے کہ اگر ضمیر پہلے آئے اور اسماء بعد میں آئیں تو واحد کی ضمیر استعمال ہو سکتی ہے یا دو اسماء کے درمیان میں ضمیر آئے تو واحد کی ضمیر آسکتی ہے لیکن اگر دو اسماء پہلے آجائیں تو پھر کبھی واحد کی ضمیر نہیں آئے گی۔ اس عربی قاعدہ کی روشنی میں بھی اگر اس آیت کو دیکھیں تو اللہ اور رسول دونوں کے اسماء پہلے آئے ہیں، لہذا قاعدہ کے مطابق ضمیر تثنیہ (ھُمَا) ہونی چاہیے تھی مگر اللہ تعالیٰ نے "حُدُوْدَہٗ" میں "ہ" واحد ضمیر بیان فرمائی۔

اس اسلوب سے اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ اللہ اور اس کے رسول دونوں میں سے جس کی مقرر کردہ حد ہو، خواہ وہ قرآن سے مقرر ہو یا وہ حدیث و سنت رسول سے مقرر ہو، وہ ایک ہی شے ہے، وہ ایک ہی حد تصور کی جائے گی اور اسے دو الگ حدیں تصور نہیں کیا جائے گا۔

عربی زبان کے تمام قواعد قرآن مجید کے تابع ہیں

ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان آیات میں قرآن مجید نے عربی زبان کے مسلّمہ اصول کو نہیں اپنایا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اس اُسلوب کو غلط نہیں کہہ سکتے کہ یہ آیت کریمہ عربی قاعدہ کے (معاذ اللہ) خلاف ہے۔ نہیں، بلکہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ عربی کے تمام قواعد قرآن مجید کے تابع ہیں، اگر کوئی عبارت ظاہراً عربی کے معروف قاعدہ کے خلاف آئے تو ہم یوں نہیں کہیں گے کہ یہ عبارت عربی قواعد کے اعتبار سے (معاذ اللہ) غلط ہے، بلکہ ہم اسے بھی عربی کا ایک قاعدہ تسلیم کریں گے۔ یعنی قرآن کا اپنایا ہوا ہر اصول اور اُسلوب بذاتِ خود ایک نیا اصول قائم کر دے گا۔

یہاں عربی قاعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوئی، بلکہ قرآن مجید کی اس آیت کے اسلوب نے ایک نیا قاعدہ اور نیا حکم وضع کر دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ جب اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا معاملہ آئے تو عربی زبان کے قاعدہ و اصول میں استثناء ہے۔ یہ عام لوگوں کی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الحمد سے والناس تک پورے قرآن مجید میں جہاں اللہ کے رسول کے علاوہ اللہ کے ساتھ کسی اور مخلوق کا ذکر آیا ہے تو وہاں واحد کی ضمیر استعمال نہیں ہوئی۔

واؤ عاطفہ ترتیب کے لیے نہیں بلکہ تشریک کے لیے ہے

یہ بات ذہن میں رہے کہ قرآن مجید میں بہت کم مقامات ایسے ہیں جہاں واؤ عاطفہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ مخلوق کو اپنے ساتھ شامل کرے۔ بالعموم اللہ تعالیٰ مخلوق کو واؤ عاطفہ (اور) لگا کر اپنے نام کے ساتھ نہیں ملاتا۔ اس لیے کہ نحو اور عربی اصول کے اعتبار سے واؤ عاطفہ ان دونوں کے جمع، اقتران اور تشریک پر دلالت کرتی ہے۔ یعنی دونوں کا اکٹھا ہونا اور اس حکم میں یکساں طور پر شریک ہونا۔ اس لیے اس واؤ عاطفہ کو واؤ مشترکہ بھی کہتے ہیں کہ یہ دونوں کو اس حکم میں اکٹھا شریک کر دیتی ہے۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ نحو کی بعض کتابوں میں یہ درج ہے کہ واؤ عاطفہ تشریک کے لیے نہیں بلکہ ترتیب کے لیے آتی ہے۔ جب مختلف احکام یا اسماء یا چیزوں کے درمیان واؤ عاطفہ آئے تو پھر وہ احکام اور چیزیں اسی ترتیب سے ہوں گی۔ یعنی واؤ عاطفہ ایک ترتیب کو ظاہر کرتی ہے کہ پہلے یہ ہوگا اور پھر یہ ہوگا، پھر یہ ہوگا۔ اس حوالے سے یہ یاد رکھیں کہ یہ ذکر یقیناً کتب نحو میں آیا ہے مگر جمہور نے اسے رد کیا ہے۔ قرآن مجید میں ایسی کئی آیات ہیں جہاں ایک آیت میں کئی چیزوں یا احکام کے درمیان واؤ عاطفہ آئی ہے مگر دوسرے مقام پر ان ہی احکام یا چیزوں کو واؤ عاطفہ لگا کر بیان کیا گیا ہے مگر وہاں بات مختلف ترتیب سے بیان ہوئی ہے۔ اگر واؤ عاطفہ کا مطلب محض ترتیب ہوتا تو دوسرے مقام پر اس ترتیب کو بدل کر آیت نازل نہ ہوتی۔ پس ثابت ہوا کہ واؤ عاطفہ ترتیب پر دلالت نہیں کرتی۔

قرآن مجید میں مذکور آیتِ وضو سے اس بات کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ۔ (المائدۃ، ۵: ۶)

”جب (تمہارا) نماز کے لیے کھڑے (ہونے کا ارادہ) ہو تو (وضو کے لیے) اپنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھو لو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں (بھی) ٹخنوں سمیت (دھو لو)۔“

اگر واؤ عاطفہ ترتیب کا فائدہ دیتی تو وضو میں اس ترتیب کو قائم رکھنا بھی فرض ہوتا، جب کہ ائمہ فقہ نے وضو کے اندر ترتیب کو فرض قرار نہیں دیا۔ مذکورہ آیت میں چار فرائضِ وضو بیان ہوئے ہیں مگر ان میں ترتیب فرض نہیں ہے۔ اگر واؤ عاطفہ ترتیب پر دلالت کرتی تو جس

طرح چار فرض ارکانِ وضو بیان ہوئے، اسی طرح ان کی ترتیب بھی پانچویں رکن کے طور پر فرض ہوجاتی، مگر ایسا نہیں ہے۔ اسی طرح کئی اور آیات بھی ایسی ہیں جہاں ایک حکم ایک ترتیب سے آیا ہے اور دوسرے مقام پر وہ ترتیب بدل گئی ہے۔ قرآن مجید کی ان آیات سے معلوم ہوا کہ واؤ عاطفہ ترتیب پر دلالت نہیں کرتی بلکہ تشریک پر دلالت کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ بالعموم مخلوق کو واؤ عاطفہ کے ذریعے اپنے ساتھ ایک فعل اور ایک حکم میں اپنے ساتھ شریک نہیں کرتا۔ یہ صرف رسول اکرم ﷺ کا استثناء ہے۔ قرآن مجید کی 100 آیات ایسی ہیں جن میں اللہ رب العزت نے واؤ عاطفہ کے ذریعے مختلف چیزوں، معاملات اور احکام میں حضور ﷺ کو اپنے ساتھ شریک کیا ہے۔ لفظِ اطاعت کے ساتھ مذکور آیات کی تعداد 38 ہے، جن میں حضور نبی اکرم ﷺ کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اسے بھی اسی طرح واجب قرار دیا ہے جس طرح اللہ کی اطاعت واجب ہے۔ قرآن مجید میں لفظ اطاعت کے ساتھ اور لفظ اطاعت کے بغیر دوسرے الفاظ کے ساتھ حضور ﷺ کی اطاعت، سنت، فرمان، حکم اور امر کے واجب ہونے کو 150 آیات کریمہ میں اس طرح بیان کیا جس طرح فرمانِ الٰہی واجب ہے۔

جبکہ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ پر بھی اپنا ذکر اور مخلوق کا ذکر واؤ عاطفہ کے ساتھ جمع نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ مخلوق کو واؤ عاطفہ کے ذریعے اپنے ساتھ شریک نہیں کرتا، یہ شان صرف حضور نبی اکرم ﷺ کو حاصل ہے۔ اس لیے کہ آقا ﷺ کے علاوہ اللہ کے

احکام ہم تک پہنچانے والا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ اللہ کے ہر حکم کو عملی شکل دینے والے رسول اکرم ﷺ ہیں۔

قرآن مجید میں صرف ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو واؤ عاطفہ کے ذریعے اپنے ساتھ ملایا ہے اور وہ بھی حضور نبی اکرم ﷺ پر درود و سلام بھیجنے کا معاملہ ہے۔ ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ۔ (الاحزاب، ۳۳: ۵۶)

"بے شک اللہ اور اس کے (سب) فرشتے نبی (مکرّم ﷺ) پر درود بھیجتے رہتے ہیں۔"

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واؤ عاطفہ کے ذریعے محبوب ﷺ پر درود پڑھنے کے اپنے فعل میں فرشتوں کو اپنے ساتھ شریک کیا ہے۔ گویا صرف عظمت مصطفی ﷺ کی خاطر مخلوق کو اپنے ساتھ جمع کیا مگر یہاں بھی ضمیر واحد کی استعمال نہیں کی بلکہ جمع کی استعمال کی۔

دوسرے مقام پر جب مومنین پر درود کی بات آئی اور وہاں حضور ﷺ کا ذکر نہیں تھا تو وہاں اسلوب مختلف اختیار کیا اور ملائکہ کو ساتھ نہیں ملایا۔ ارشاد فرمایا:

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ (الاحزاب، ۳۳: ۴۳)

"وہی ہے جو تم پر درود بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی، تاکہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لے جائے۔"

یہاں اپنے اور فرشتوں کے ذکر کے درمیان عَلَيْكُمْ کہہ کر فاصلہ اور فرق کیا۔ پہلے اپنے حوالے سے جملہ مکمل کر دیا کہ وہی ذات ہے جو تم پر درود بھیجتی ہے۔ اس کے بعد اب واؤ عاطفہ لگا کر فرمایا کہ اور فرشتے بھی بھیجتے ہیں۔ گویا جب مخلوق پر درود بھیجنے کی بات کی تو اپنا ذکر الگ حیثیت میں کیا اور ملائکہ کے عمل کو الگ بیان کیا مگر جب مصطفی ﷺ پر درود پڑھنے کی بات آئی تو ملائکہ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔

۲۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ دونوں کے لیے واحد ضمیر کے استعمال کی وضاحت میں ایک اور آیت ملاحظہ ہو۔ ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ۔ (الانفال، ۸: ۲۰)

"اے ایمان والو! تم اللہ کی اور اس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو اور اس سے رُوگردانی مت کرو حالاں کہ تم سن رہے ہو۔"

عام عربی قاعدے کی رُو سے چاہیے یہ تھا کہ یہ کہا جاتا کہ: وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُمَا کہ ان دونوں سے رو گردانی مت کرو مگر یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے رسول ﷺ کے لیے واحد ضمیر

استعمال کی کہ وَلَا تَتَوَلَّوْا عَنْهُ کہ ''اس سے'' رو گردانی مت کرو۔آیت میں اطاعتیں دونوں کی بیان کیں مگر جب رو گردانی کے حوالے سے حکم واضح کرنا تھا تو اس کے لیے کہہ دیا کہ وَلَا تَتَوَلَّوْا عَنْهُ۔

(ہ) واحد کی ضمیر استعمال کی کہ 'اس سے رو گردانی نہ کرو۔'

سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ واحد ضمیر استعمال کر کے اللہ اور اس کے رسول دونوں میں سے کس سے رو گردانی سے منع کیا جا رہا ہے؟ اس لیے کہ پیچھے دونوں کی اطاعت کا حکم آ رہا ہے کہ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ کہ 'اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔' اگر ایک کا ذکر ہوتا تو تَتَوَلَّوْا عَنْهُ کا معنی واضح تھا کہ جس کی اطاعت کا حکم ہے، اسی کے حکم سے رو گردانی کرنے سے روکا جا رہا ہے۔ یہاں حکم تو دو اطاعتوں کا ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور پھر حکم آ گیا کہ 'اس کے حکم سے رو گردانی نہ کرو۔' اب اس ''ہٗ'' ضمیر کا مرجع کیا ہو گا؟ اسے اللہ اور رسول دونوں میں سے کس کی طرف لوٹایا جائے گا؟

اللہ رب العزت اس اسلوب سے دراصل یہی حکم سمجھانا چاہتا ہے کہ جہاں میرے اور میرے محبوب ﷺ کے حکم سے رو گردانی سے ممانعت کی بات آئے تو ''اِس'' اور ''اُس'' کے فرق کو مٹا دو۔ رسول کے حکم کی نافرمانی کرو گے تو تب بھی یہ اللہ کی نافرمانی متصور ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے اس اسلوب کے ذریعے اس فتنے کی جڑ کاٹ دی جو کہتے ہیں کہ 'ہم قرآن مجید کو حجت مانتے ہیں اور حکمِ رسول اور سنت و حدیثِ رسول کو حجت نہیں مانتے۔' قرآن

مجید کہتا ہے کہ اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت کا مطلب قرآن مجید کا حجت ہونا اور رسول کی حدیث کا حجت ہونا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ ''اُس'' کے حکم کی نافرمانی نہ کرو۔ قرآن مجید نے دونوں کو ''اُس'' کہہ کر ثابت کردیا کہ حکم حدیثِ رسول کا ہو یا حکم کتابِ الٰہی کا ہو، حجیت کے اعتبار سے یہ دونوں ایک ہیں، دو نہیں ہیں۔

۳۔ اس اسلوب پر مبنی ایک اور آیت ملاحظہ ہو۔ ارشاد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ۔ (الأنفال، ۸: ۲۴)

''اے ایمان والو! اللہ اور رسول (ﷺ، دونوں) کی طرف فرمانبرداری کے ساتھ جواب دیتے ہوئے (فوراً) حاضر ہو جایا کرو۔ جب وہ تمہیں کسی کام کے لیے بلائے جو تمہیں (جاودانی) زندگی عطا کرتا ہے۔''

اس آیت میں اِذَا دَعَاكُمْ ضمیر واحد ہے۔ عربی قاعدہ کی رو سے ہونا یہ چاہیے تھا کہ اِذَا دعاواکم کہ جب وہ دونوں تمہیں بلائیں۔'' یعنی تثنیہ (دو) کا صیغہ ہونا چاہیے تھا مگر یہاں تثنیہ کا صیغہ استعمال نہیں کیا بلکہ ضمیر واحد استعمال کی اور فرمایا: اِذَا دَعَاكُمْ؛ ''جب وہ تمہیں بلائے۔''

اس اسلوب سے اللہ تعالیٰ نے واضح کردیا کہ کوئی اللہ تعالیٰ کے بلاوے کو رسول کے بلاوے سے الگ نہ سمجھے اور رسول کے حکم اور بلاوے کو اللہ کے حکم اور بلاوے سے الگ نہ سمجھے۔ اس اسلوب کو اختیار اس لیے کیا کہ اذہان میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ ایک طرف حکمِ الٰہی، قرآن مجید اور اطاعتِ الٰہی ہے اور دوسری طرف حکمِ رسول، حدیث وسنت اور اطاعتِ رسول ہے، اِن دونوں کا حکم یہ ہے کہ دونوں کی دعوت ایک ہے۔۔۔ دونوں کی حجیت ایک ہے۔۔۔ دونوں کا وجوب ولزوم ایک ہے۔۔۔ اتھارٹی ہونے میں ان دونوں کو جدا جدا نہیں کرسکتے۔ اللہ تعالیٰ نے دو کو ایک کے حکم میں شامل کردیا۔ سو بحیثیت مسلمان ہمیں یہ اختیار نہیں پہنچتا ہے کہ ہم دَعَاكُمْ کو توڑ کر دعاواکم کردیں، ان کے حکم کی حجیت کو جدا کردیں اور ایک کو مانیں اور ایک کا انکار کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس اختیار کو رد کردیا ہے۔ پس کوئی رسول کے حکم اور ان کی اطاعت سے انکار کا راستہ پیدا نہ کرے۔ اس لیے کہ اللہ اور اس کے رسول کا بلاوا ایک ہے۔۔۔ حکم وفرمان ایک ہے۔۔۔ حجیت ووجوب ایک ہے۔۔۔ اطاعت ایک ہے۔۔۔ اور ان کی فرضیت ولزوم ایک ہے۔ ہم اسے علیحدہ نہیں کر سکتے۔

(جاری ہے)

فلسفۂ قربانی

دارالافتاء تحریک منہاج القرآن، زیرنگرانی: مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی

سوال: قرآن وسنت کی روشنی میں قربانی کا فلسفہ بیان فرمائیں۔

جواب: ''قربانی'' عربی زبان کے لفظ ''قُرب'' سے ہے، جس کا مطلب ''کسی شے کے نزدیک ہونا'' ہے۔ ''قُرب''، دوری کا متضاد ہے۔ 'قربان' 'قرب' سے مبالغے کا صیغہ ہے۔ امام راغب اصفہانی قربانی کا معنٰی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

القربان مایتقرب به الی الله وصارفی التعارف اسماً للنسیکة التی هی الذبیحة. (المفردات للراغب ۴۰۸)

قربانی وہ چیز ہے جس کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کیا جائے، شرع میں قربانی جانور ذبح کرنے کا نام ہے۔

قربانی کے لئے قرآن کریم میں تین الفاظ استعمال ہوئے ہیں:

۱۔ قربانی ۲۔ منسک ۳۔ نحر

۱۔ لفظ قربانی قرآن مجید میں یوں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۔ (المائدہ، ۵: ۲۷)

”(اے نبی مکرم!) آپ ان لوگوں کو آدم (علیہ السلام) کے دو بیٹوں (ہابیل و قابیل) کی خبر سنائیں جو بالکل سچی ہیَ جب دونوں نے (اللہ کے حضور ایک ایک) قربانی پیش کی سو ان میں سے ایک (ہابیل) کی قبول کر لی گئی اور دوسرے (قابیل) سے قبول نہ کی گئی تو اس (قابیل) نے (ہابیل سے حسداً و انتقاماً) کہا: میں تجھے ضرور قتل کر دوں گا اس (ہابیل) نے (جواباً) کہا: بے شک اللہ پرہیزگاروں سے ہی (نیاز) قبول فرماتا ہے۔“

۲۔ لفظ منسک قرآن مجید میں یوں استعمال ہوا۔ ارشاد فرمایا:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْأَنْعَامِ فَإِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗ أَسْلِمُوْا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ۔ (الحج، ۲۲: ۳۴)

” اور ہم نے ہر امت کے لیے ایک قربانی مقرر کر دی ہے تاکہ وہ ان مویشی چوپایوں پر جو اللہ نے انہیں عنایت فرمائے ہیں (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیں، سو تمہارا معبود ایک (ہی) معبود ہے پس تم اسی کے فرمانبردار بن جاؤ، اور (اے حبیب!) عاجزی کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیں۔“

۳۔ لفظ نحر قرآن مجید میں یوں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد فرمایا:

إِنَّآ أَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ۔

”بیشک ہم نے آپ کو (ہر خیر و فضیلت میں) بے انتہا کثرت بخشی ہے۔ پس آپ اپنے رب کے لئے نماز پڑھا کریں اور قربانی دیا کریں (یہ ہدیہ تشکّر ہے)۔ بیشک آپ کا دشمن ہی بے نسل اور بے نام و نشاں ہوگا۔“ (الکوثر، ۱۰۸: ۱۔۳)

قرآن کریم سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم پر قربانی لازم کی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہر امت پر نماز و روزہ فرض فرمائے۔

ہر انسان کو بڑی بڑی تین نعمتیں ملی ہیں:

۱۔ جان کی نعمت، اس کا شکریہ یہ ہے کہ اپنی تمام صلاحیتوں کو اطاعت خداوندی میں استعمال کیا جائے۔ ہاتھ پاؤں زبان اور دماغ سے مخلوق خدا کو فائدہ پہنچایا جائے۔

۲۔ مال کی نعمت، اس کا شکریہ ہے کہ حلال و جائز ذرائع سے مال حاصل کیا جائے، اللہ کی رضا کے لئے غریبوں ناداروں یتیموں اور حاجت مندوں کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے میں اسے خرچ کیا جائے۔ مال میں وہ پالتو جانور بھی شامل ہیں جو قدرت نے ہمارے لئے مسخر فرمائے ہیں۔ جن سے ہمیں

اون، کھال، دودھ اور گوشت حاصل ہوتا ہے۔ ان سے ہم سواری و بار برداری کا کام لیتے ہیں۔ ان کے ایک ایک عضو سے ہمیں بے شمار فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ ان کا شکریہ ہے کہ ہم ان کے منافع میں ان کو شریک کریں جو اس نعمت سے محروم ہیں۔ سواری و بار برداری کی سہولتوں سے ان کو بھی بہرہ مند کریں۔ ذبح کریں تو ان کا گوشت دوسروں کو بھی دیں۔ دودھ جیسے نعمت حاصل ہو تو حسبِ توفیق ناداروں کو ان کا حصہ ادا کریں۔ ان جانوروں کے ذریعے جوئے جیسا حرام کاروبار نہ چلائیں۔ ان کو آپس میں لڑا لڑا کر لہولہان نہ کریں۔ صرف اللہ کے نام پر ذبح کریں۔ کسی اور کے نام پر ذبح نہ کریں قربانی دم تمتع، دم احصار، ہدی، نذر اور دم جنایت کے طور پر جو جانور ذبح کرو، اسے ان تلوثیات سے پاک رکھو، جن سے دور جاہلیت کے مشرک اسے ملوث کرتے تھے کہ جانور ذبح کیا اور اس کا خون کعبے کی دیواروں پر لتھیڑ دیا، بتوں کے آستانوں پر لگا دیا اور گوشت ضائع کر دیا۔ قربانی کا گوشت خود بھی کھاؤ، دوسروں کو بھی کھلاؤ، غریب ہو یا امیر سبھی کھا سکتے ہیں۔

۳۔ علم کی نعمت، علم مفید حاصل کریں یہ آپ کا پیدائشی حق بھی ہے اور آپ پر فرض بھی۔ اس کا شکریہ ہے کہ ہم اس پر عمل کریں۔ اس کو دوسروں تک پہنچائیں اور کوئی علمی بات کسی سے نہ چھپائیں، نہ لالچ سے نہ کسی کے ڈر سے۔

ظاہر ہوا کہ قربانی مسلمانوں پر حسب توفیق لازم ہے۔ سورۃ کوثر میں نماز قربانی کو ایک ساتھ جمع ہونا اس بات کا غماز ہے کہ جس طرح نماز اپنی شرائط کے ساتھ اوقاتِ مقرر پر لازم ہے اسی طرح قربانی بھی اپنی شرائط کے ساتھ اوقاتِ مقررہ پر لازم ہے جیسے نماز کسی خاص مقام کے ساتھ مقید نہیں ، ہر جگہ کے لئے عام ہے، اسی طرح قربانی بھی کسی مخصوص جگہ کے لئے نہیں، ہر جگہ کے مسلمانوں کے لئے حکم شرعی ہے۔

امام ترمذی وابن ماجہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَاعَمِلَ ابْنُ اٰدَمَ يَوْمَ النَّحْرِ عملاً اَحَبَّ اِلَى اللهِ مِنْ هَرَاقَةِ الدَّمِ وانَّه لَيَاْتِيْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِقُرُوْنِهَا وَاشعارِهَا وَاَظْلَافِهَا وَاِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ اَنْ يَّقَعَ على الارض فَطِيْبُوْا بِهَا نَفْسًا.

”ابن آدم نے قربانی کے دن خون بہانے (قربانی کرنے) سے زیادہ خدا کے حضور پسندیدہ کوئی کام نہیں کیا اور بے شک وہ قربانی کا جانور قیامت کے دن اپنے سینگوں بالوں اور کھروں کے ساتھ آئے گا اور بے شک خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ کے ہاں مقام قبول میں پہنچ جاتا ہے۔ لہذا خوش دلی سے قربانی کیا کرو“۔

(سنن ابن ماجہ، جلد ۲، باب ثواب الاضحیہ، رقم: ۱۰۴۵)

پس جو قربانی صدق واخلاص سے دی جائے اس قربانی کے خون کا قطرہ زمین پر گرنے سے پہلے اللہ کی بارگاہ میں شرف قبولیت پاجاتی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

ضَحّیٰ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بِكَبْشَيْنِ اَمْلَحَيْنِ اَقْرَنَيْنِ ذَبَحَهُمَا بِيَدِهٖ وَسَمّٰى وَكَبَّرَ قَالَ رَاَيْتُهُ وَاضِعًا قَدَمَهُ عَلٰى صِفَاحِهِمَا وَيَقُوْلُ بِسْمِ اللهِ وَاللهُ اَكْبَرُ. (مشکوۃ، باب الاضحیۃ، ص: ۱۲۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو چتکبرے سینگوں والے مینڈھے اپنے ہاتھ سے قربانی کے لئے ذبح فرمائے۔ بسم اللہ پڑھ کر اور اللہ اکبر کہہ کر (بسم اللہ اللہ اکبر) کہتے ہیں، میں نے حضور کو ان کے پہلوؤں پر قدم رکھے دیکھا اور فرماتے جاتے بسم اللہ، اللہ اکبر۔

اپنے ہاتھ سے قربانی کرنے میں حکمت یہ ہے کہ عمل قربانی میں انسان کی اپنی دلچسپی ہو۔ اگر قربانی کا جانور قصاب کے حوالے کر دیا اور خود کسی اور کام میں مصروف ہو گئے تو اس طرح سے قربانی ہو جاتی ہے لیکن اس میں اس دلچسپی کا مظاہرہ نہ ہو سکا جتنی دلچسپی کا اظہار خون گراتے وقت ظاہر ہوتی تھی کیونکہ قربانی کا فلسفہ محض جانور ذبح کر دینا اور گوشت تقسیم کرنا نہ تھا بلکہ ہاتھ سے اس جانور کا خون بہانا تھا اور جب خون بہانے کا کام انسان نے اپنے ہاتھ سے نہ کیا تو عمل قربانی میں حسنِ نیت اپنے کمال کو نہ پہنچی۔ اس لئے سنت یہ ہے کہ قربانی اپنے ہاتھ سے کی جائے۔

امام مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سینگوں والا مینڈھا لانے کا حکم دیا۔ جو سیاہی میں چلتا ہو، سیاہی میں بیٹھتا ہو اور سیاہی میں دیکھتا ہو یعنی اس کے پاؤں، پیٹ اور آنکھیں سیاہ ہوں، وہ قربانی کے لئے حاضر کیا گیا۔ فرمایا عائشہ! چھری لاؤ، پھر فرمایا: اسے پتھر پر تیز کرو، میں نے تیز کر دی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چھری پکڑی، مینڈھا لٹایا، اسے ذبح کیا پھر فرمایا:

بِسۡمِ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلۡ مِنۡ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ وَّمِنۡ اُمَّۃِ مُحَمَّدٍ

الٰہی محمد ﷺ، آپ کی آل اور آپ کی امت کی طرف سے قبول فرما۔ (مشکوۃ، ۱۲۷)

قربانی میں مقصود گوشت نہیں ہوتا بلکہ قربانی کے عمل کی روح صرف چُھری چلا کر بسم اللہ، اللہ اکبر کہتے ہوئے اللہ کے نام پر خون بہادینا ہے۔ پس اس خون کے قطرے کے گرانے کو قربانی کہتے ہیں جبکہ گوشت کی تقسیم کا معاملہ، عام صدقے کی طرح ایک صدقہ ہے۔ جس طرح ہم اس قربانی کے علاوہ غرباء میں گوشت تقسیم کرتے رہتے ہیں۔

نیز یہ بھی کہ قربانی کے گوشت کی تقسیم کا ایک سنت طریقہ ہے کہ اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے:

۱۔ غرباء کے لئے ۲۔ رشتہ داروں کے لئے ۳۔ اپنے لئے

لیکن اگر اپنی فیملی کے احباب زیادہ ہوں تو خود دو حصے بھی رکھ سکتے ہیں اور اگر دو حصے بھی کفایت نہ کریں تو سارے کا سارا گوشت خود بھی رکھ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قربانی کا مقصود صرف گوشت کی تقسیم نہیں بلکہ مقصودِ قربانی اللہ کی رضا کے لئے اس کے نام پر خون بہانا ہے۔ اگر مقصود گوشت کی تقسیم ہوتی تو یہ عمل تو سال بھر ہوتا رہتا ہے لیکن عیدالاضحی کو جس سبب سے عید قربان کہا جاتا ہے، وہ گوشت کی تقسیم نہیں بلکہ اللہ کی رضا کے لئے اس خون کو گرانے کا عمل ہے جو بندے کو اللہ کا قرب عطا کرتا ہے کہ اللہ کی رضا کے لئے جان کے نذرانے کی علامت کے طور پر خون گرایا جاتا ہے۔

سوال: کیا کوئی دوسرا شخص کسی صاحبِ نصاب کی طرف سے قربانی کر سکتا ہے؟ یہ بھی واضح فرمادیں کہ کیا زکوۃ کی رقم سے قربانی کی جاسکتی ہے؟

جواب: زکوۃ دینا فرض ہے، اگر کسی بھی مسلمان کے پاس اتنا مال ہے کہ وہ نصاب تک پہنچ جاتا ہے اور اس مال پر ایک سال گزر جاتا ہے تو ایسا صاحب نصاب شخص زکوۃ دے گا۔

قربانی دینا واجب ہے، صاحب نصاب شخص کے لئے عیدالاضحی پر قربانی دینا واجب ہے۔

اگر کوئی شخص صاحب نصاب ہے اور کوئی اس سے پیسے لیے بغیر اپنے پیسوں سے اس کی طرف سے قربانی کر دے تو یہ قربانی اس شخص کی طرف سے نہیں ہو گی۔ بندہ جب تک اپنے مال سے قربانی اور زکوۃ ادا نہیں کرے گا، اس وقت قربانی اس کے ذمہ رہے گی، اس کا واجب ادا نہیں ہو گا۔ البتہ اگر وہ اپنے حصہ کی قیمت ادا کر دیتا ہے تو پھر اسے الگ سے قربانی کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ قربانی اسی کی طرف سے شمار ہو گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ زکوۃ اور قربانی الگ الگ ہے۔ زکوۃ کے پیسوں سے قربانی دینا جائز نہیں۔ زکوۃ الگ دیں گے، جب مال پر ایک سال گزرے گا اور قربانی ہر سال عیدالاضحی کے موقع پر اپنے مال میں سے دیں گے۔

سوال: کن جانوروں کی قربانی کرنا جائز نہیں؟

جواب: حدیث مبارکہ کی روشنی میں درج ذیل چار قسم کے جانوروں کی قربانی جائز نہیں:

۱۔ اندھا، جس کا اندھا پن ظاہر ہے۔

۲۔ بیمار، جس کی بیماری ظاہر ہو رہی ہو۔

۳۔ لنگڑا، جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو۔

۴۔ لاغر، جس کی ہڈیوں میں مغز نہ ہو۔

(ابن ماجہ، السنن، کتاب الأضاحی، باب مایکرہ ان یضحی بہ، ۳: ۵۴۲، رقم: ۳۱۴۴)

سوال: مشترکہ رقم یا زیور کی صورت میں قربانی کس کی طرف سے ادا ہو گی؟

جواب: اصل میں شادی و نکاح کے موقع پر جو زیور وغیرہ عورت کو ملتا ہے، وہ اسی کا ہوتا ہے مرد تو زیور پہنتے ہی نہیں۔ اگر سونا اور رقم میاں بیوی کی مشترکہ ہے تو اس کو تقسیم کر لیں پھر اگر دونوں یا دونوں میں سے ایک صاحب نصاب ہو تو اس پر قربانی واجب ہو گی اور اس طرح اگر سال گزر جائے تو زکوۃ بھی ادا کرنا ہو گی۔ کوئی اگر صاحب نصاب ہو تو قربانی اور زکوۃ ادا کرنا واجب ہے چاہے وہ ادائیگی سونا بیچ کر کی جائے یا اپنے گھر والے/والی سے لے کر، وہ اس کی مرضی ہے۔

حج اور قربانی کی روح: تزکیۂ نفس اور خدمتِ خلق

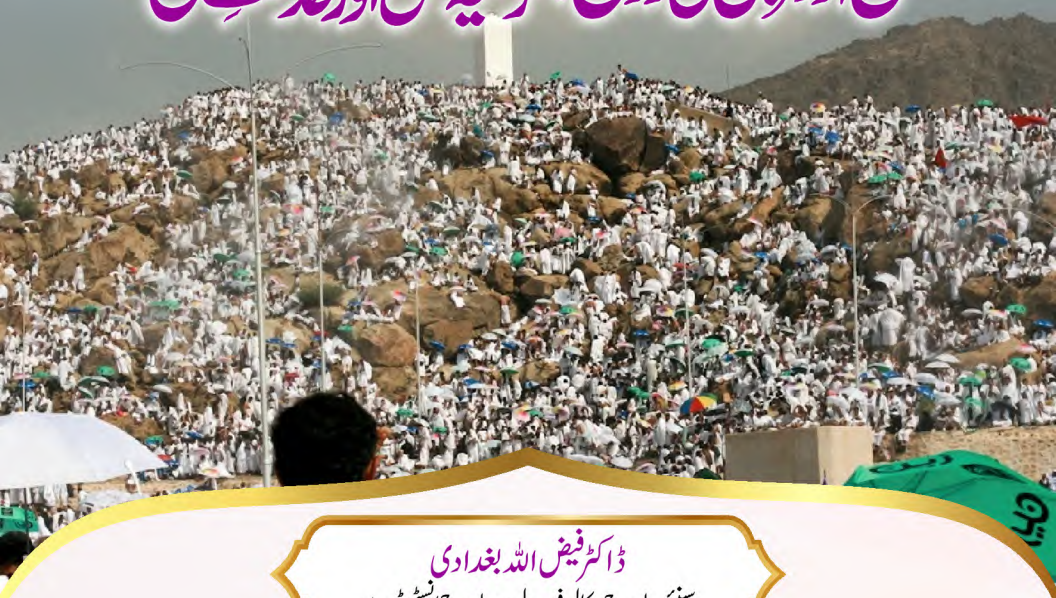

ڈاکٹر فیض اللہ بغدادی
سینئر ریسرچ سکالر فرید ملت ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

اسلام ایک جامع دین ہے جو انسان کی انفرادی و اجتماعی، ظاہری و باطنی، جسمانی و روحانی، ہر پہلو کی تربیت کرتا ہے۔ اس دینِ فطرت کے عظیم شعائر میں "حج" اور "قربانی" کو خاص مقام حاصل ہے۔ یہ دونوں عبادات نہ صرف اللہ تعالیٰ سے بندگی کا عہد ہیں بلکہ وہ روحانی اسباق بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں جو آج کے انسان کو تزکیۂ نفس، ایثار، قربانی، مساوات، اخوت اور خدمتِ خلق کا پیغام دیتے ہیں۔ عصر حاضر میں جب مادّہ پرستی، خود غرضی، نفسا نفسی اور اجتماعی بے حسی کا غلبہ ہے، حج اور قربانی کی روح کو از سر نو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ زیر نظر مضمون میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ کیسے حج اور قربانی کی اصل روح تزکیۂ نفس اور خدمتِ خلق ہے۔

حج کا مفہوم و اہمیت

حج کا لغوی معنی ارادہ کرنا ہے، اور اصطلاح میں اس کا معنی ہے:

هو عبارة عن الأفعال المخصوصة من الطواف والوقوف في وقته محرما بنية الحج سابقا. (الفتاوی الہندیہ، ۱: ۲۱۶)

حج: مخصوص افعال مثلاً طواف اور وقوف اپنے وقت میں بحالت احرام پہلے سے حج کی نیت سے ادا کرنے سے عبارت ہے۔

حج ارکان اسلام میں سے ایک بنیادی رکن ہے۔ اُمت مسلمہ پر اس کی فرضیت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ثابت ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا۔

اور اللہ کے لئے لوگوں پر اس گھر کا حج فرض ہے جو بھی اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو۔ (آل عمران: ۹۷)

گویا حج ہر اس شخص پر زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے جو صاحبِ استطاعت ہو۔ صاحبِ استطاعت ہونے سے مراد ہے جو سفری اخراجات برداشت کر سکتا ہو اور اپنے اہل و عیال کے لئے بھی اتنا مال و متاع رکھتا ہو کہ اس کے ادائیگی حج پر جانے کے بعد وہ کسی کے دست نگر نہ ہوں، اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی صحت بھی اس قابل ہو کہ وہ سفر اور مناسک حج کی تکالیف کو جھیل سکتا ہو۔

حج کی فضیلت و اہمیت پر بہت ساری احادیث وارد ہوئی ہیں، جیسا کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے حج مبرور کو فضیلت والے اعمال میں سے ایک شمار کیا ہے، اور اس کی جزا جنت کو قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جو رضائے الٰہی کے لئے حج کرے جس میں نہ کوئی بے ہودہ بات ہو اور نہ کسی گناہ کا ارتکاب، وہ حج کر کے ایسے لوٹے گا جیسے اس کی ماں نے اسے ابھی جنا ہو۔

حج کی مشروعیت پر اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت ہم پر آشکار ہو گی کہ یہ محض ایک سفر یا رسمی عبادت نہیں بلکہ یہ ایک جامع تربیت گاہ ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ۔ (الحج: ۲۷)

”اور تم لوگوں میں حج کا بلند آواز سے اعلان کرو۔ وہ تمہارے پاس پیدل اور تمام دبلے اونٹوں پر (سوار) حاضر ہو جائیں گے جو دور دراز کے راستوں سے آتے ہیں۔“

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ حج انسانیت کے ہر طبقے کو ایک مرکز پر اکٹھا کرتا ہے، جہاں کوئی امیر و غریب، عربی و عجمی، کالا و گورا نہیں بلکہ سب اللہ کے بندے ہوتے ہیں۔ حج میں احرام باندھنا، دنیاوی لباس سے دستبرداری، نفسانی خواہشات کی قربانی اور طواف و سعی جیسے اعمال دراصل نفس کی تطہیر کا ذریعہ بنتے ہیں۔

اگر حج کے پورے عمل کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا سارے کا سارے عمل تزکیۂ نفس اور خدمتِ خلق پر منتج ہوتا ہے۔ حج کے لئے دیگر عبادات کی بہ نسبت جگہ کو متعین کر دیا گیا۔ دیگر عبادات ہم کسی بھی جگہ پر ادا کر سکتے ہیں، مثلاً: نماز کسی بھی پاک زمین پر ادا کر سکتے ہیں، اسی طرح روزہ کہیں بھی رکھا جا سکتا، زکوۃ کہیں بھی دی جا سکتی ہے، صدقہ و خیرات کہیں بھی دیے جا سکتے ہیں، لیکن حج ایک

مخصوص جگہ کے علاوہ کہیں بھی ادا نہیں کیا جاسکتا، اس کے مناسک کے لیے چند مقامات مخصوص ہیں، یہ وہیں ادا ہوتے ہیں کسی اور جگہ ادا نہیں ہو سکتے۔

حج: تزکیہ و تطہیرِ نفس کا ذریعہ

جب یہ بات ہم نے سمجھ لی تو اس میں نفس کی تطہیر کا پہلو بھی آسانی سے سمجھ آ جائے گا۔ وہ اس طرح کہ نفس انسانی جس جگہ رہ رہا ہو، وہ اس سے مانوس ہوتا ہے لیکن حج جیسی عبادت کے لئے انسان کو اپنا وطن مالوف چھوڑنا پڑتا ہے، نہ صرف وطن مالوف بلکہ اپنے اہل و عیال، اپنے اعزا و اقارب، اپنے دوست احباب، اپنا گھر بار، اپنا کاروبار سب کچھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر چھوڑنا پڑتا ہے۔ اس سے انسان کو دائمی طور پر اس دنیا کو چھوڑنے کا بھی خیال آتا ہے کہ جب وہ ان سب مانوس چیزوں کو چھوڑ کر راہی ملک عدم ہو جائے گا۔

اسی طرح جب بندہ میقات پر پہنچتا ہے تو علاقائی زرق برق اور قیمتی لباس اتار کر دو سفید کپڑے (احرام) پہن لیتا ہے، اس سے اسے سادگی اور مساوات کا درس میسر آتا ہے، اس کے علاوہ مرنے کے بعد کفن پہنائے جانے کا خیال دل میں جاگزیں ہوتا ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا: "محرم کون سا لباس نہ پہنے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

لَا يَلْبَسُ الْقَمِيصَ وَلَا الْعِمَامَةَ وَلَا السَّرَاوِيلَ وَلَا الْبُرْنُسَ۔ (صحيح البخاري، ۱: ۲۲۸، رقم: ۱۳۱)

"قمیص، عمامہ، پاجامہ، شلوار اور موزے نہ پہنے۔"

ایک بدو سے آپ ﷺ نے فرمایا:

أَمَّا الطِّيبُ الَّذِي بِكَ فَاغْسِلْهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، وَأَمَّا الْجُبَّةُ فَانْزِعْهَا۔

"جو خوشبو تمہارے جسم پر ہے، اسے تین بار دھو ڈالو، اور جو جبہ ہے اسے اتار دو۔"

ان احادیث سے جہاں ہمیں احرام کے بارے میں کئی فقہی احکام کا پتا چلتا ہے، وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ احرام کی حالت دراصل عبادت کی اعلیٰ ترین کیفیت ہے جس میں بندہ اپنی دنیاوی حیثیت، شان، اور زیب و زینت کو ترک کر کے خالص عبدیت کی طرف لوٹتا ہے۔ یہ لباس اور خوشبو کی ممانعت باطنی خشوع کے ظاہری اظہار کے لیے ہے۔ انسان جب لباسِ فخر و تفاخر چھوڑ کر سادہ دو چادروں میں آ جائے تو تذلل اور خضوع پیدا ہوتا ہے۔

ان احکام کی بعض تفصیلات عقل کو بظاہر غیر منطقی لگ سکتی ہیں، لیکن ان کا مقصد صرف اللہ کے حکم کی تعمیل اور بندگی کا اظہار ہے۔

جیسا کہ امام غزالی نے فرمایا: ''ایسے اعمال جن کی علت سمجھ میں نہ آئے، وہ بندگی کی اصل روح کو نمایاں کرتے ہیں۔''

لباس، خوشبو، زیب وزینت ترک کرنا دراصل دنیاوی وابستگیوں سے نجات کی عملی تربیت ہے، جو تزکیۂ نفس کا اہم ذریعہ ہے۔ اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حج و عمرہ محض ظاہری اعمال نہیں، بلکہ ان کے پیچھے ایک گہری روحانی تربیت ہے۔ احرام کی حالت میں لباس و خوشبو کی ممانعت ہمیں بندگی، عاجزی، اور دنیا سے بے نیازی کا سبق دیتی ہے، اور اللہ کے حکم کے سامنے عقل کو سرنگوں کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔

''شاہ ولی اللہ دہلوی، حجۃ اللہ البالغۃ (۲: ۹۱) میں لکھتے ہیں: ''حج و عمرہ کا احرام نماز میں تکبیر کے مثل ہے، جس میں اخلاص، تعظیم اور نیت کی مضبوطی کا ظاہری اظہار ہوتا ہے۔ اس میں عادتیں ترک کرکے اللہ کے حضور عاجزی اور خشیت ظاہر کی جاتی ہے۔''

اس لیے احرام میں زینت، شکار اور دیگر معمولات زندگی سے اجتناب کی تاکید کی گئی ہے تاکہ دل میں اللہ کی عظمت کا احساس پیدا ہو اور نفس کی سرکشی کو قابو میں لایا جائے۔

احکامِ حج کی عقلی توجیہ ممکن نہیں

علاوہ ازیں حج کے بہت سارے مناسک ایسے ہیں جن کی عقلی توجیہ ممکن نہیں ہے لیکن پھر بھی ان کو بجالانا مقبول حج کے لیے از حد ضروری ہے۔ یہ سب یا تو اس لیے کہ اللہ کے پیاروں کی ادائیں دوہرائی جاتی رہیں یا یہ نفسِ انسانی کی تربیت ہے کہ جو بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ہو، اسے بلا چون وچرا پورا کیا جائے اس میں خیر ہی خیر ہے خواہ وہ عقل میں آنے والی شے ہو یا ماورا عقل شے ہو۔ جیسا کہ حاجی بیت اللہ کے گرد دیوانہ وار چکر لگاتا ہے۔ عقل اس سے اس کی وجہ پوچھتی ہے۔۔۔ وہ تلبیہ کہتا ہے: ''لبیک اللھم لبیک...'' اور بلند آواز سے دہراتا ہے۔ عقل کہتی ہے: ''چیخنے کی کیا ضرورت ہے؟''۔۔۔ پھر جب خانہ کعبہ پر نظر پڑتی ہے، تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ عقل کہتی ہے: ''رونے کی کیا بات ہے؟''۔۔۔ پھر وہ مزدلفہ سے منیٰ واپس آتا ہے اور جمرات کو کنکریاں مارتا

ہے، تو عقل کہتی ہے: ''کیا تمہیں جنون ہو گیا ہے؟ ان بے جان پتھروں کو کیوں مار رہے ہو۔۔۔؟'' لیکن ان سب سوالوں کا جواب دینے سے عقل عاجز ہے۔ فقط یہ بات کہ ان اعمال کی انجام دہی کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ ان اعمال کی انجام دہی سے انسان احکامِ الٰہیہ کی ہر حال میں پابندی اور اُس کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا سیکھتا ہے۔

امام غزالی احیاء علوم الدین (۱: ۲۱۵) میں کہتے ہیں: ''رمی جمار جیسا عمل صرف بندگی کے اظہار کے لیے ہے۔ چونکہ اس کا کوئی عقلی مفہوم نہیں، اس لیے اس میں صرف اللہ کے حکم کی تعمیل مقصود ہے۔ عقل اس میں مداخلت نہیں کر سکتی۔ یہی خالص بندگی ہے۔''

اسی لیے حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

لبيك بحجة حقًا تعبّدًا ورقًّا

یعنی: میں حاضر ہوں، حج کے لیے، حق کے ساتھ، عبادت و بندگی کے طور پر۔ (المغني عن حمل الأسفار، ۱: ۱۶۵)

یہاں حضور نبی اکرم ﷺ نے تلبیہ میں حج کی روح اور نیت کو واضح فرمایا کہ حج صرف ایک جسمانی سفر یا مذہبی رسم نہیں، بلکہ یہ اللہ کے لیے ایک سچا، خالص، عاجزانہ اور عبادت بھرا عمل ہے۔ انسان حج میں اپنی خودی، غرور اور دنیاوی وابستگیوں کو چھوڑ کر مکمل طور پر اللہ کے حضور حاضر ہوتا ہے، جیسے ایک بندہ اپنے آقا کے دربار میں عاجزی سے حاضر ہوتا ہے۔

سو حج ایک عظیم عبادت ہے جس کے ہر پہلو میں گہرے روحانی اور اجتماعی معانی پوشیدہ ہیں۔ حج کے مختلف مناسک جیسے طواف، صفا و مروہ کی سعی، منیٰ، عرفات اور مزدلفہ کی طرف جانا یہ سب اعمال انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں، گو کہ عقلِ محض ان کے اسرار کو مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتی۔

یہ مناسک دراصل انسان کو نفس کی سرکشی سے بچانے، اس کی خواہشات پر قابو پانے اور دل کو اللہ کی محبت و بندگی سے منور کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ حاجی جب ان اعمال کو انجام دیتا ہے تو وہ نہ صرف اپنے رب کے حضور جھکتا ہے بلکہ اپنی ذات، غرور اور خواہشات کو بھی فنا کرتا ہے۔

مزید برآں، حج ایک ایسا عالمی اجتماع ہے جہاں رنگ، نسل، زبان اور قومیت کے فرق

مٹ جاتے ہیں۔ سب ایک ہی لباس میں، ایک ہی نیت کے ساتھ، ایک ہی رب کے حضور سر بسجود ہوتے ہیں۔ یہ حج کا وہ پہلو ہے جو مساوات، اخوت اور اتحاد کا عملی مظہر ہےاور یہی وہ اقدار ہیں جن کی آج کی منتشر اور متعصب دنیا کو شدید ضرورت ہے۔

یوں حج صرف ایک عبادت ہی نہیں، بلکہ ایک جامع تربیت ہے جو انسان کے باطن کو پاک، معاشرت کو منظم اور امت کو متحد کرتی ہے۔

قربانی: مفہوم اور اہمیت

واجبات حج میں سے ایک قربانی بھی ہے جس کا کرنا ہر حاجی کے لئے ضروری ہے، اسی طرح امت مسلمہ کے ہر صاحبِ استطاعت فرد پر قربانی واجب ہے، قربانی کیا ہے؟ امام راغب اصفہانی اس کی تعریف یوں کرتے ہیں:

القربان ما یتقرب بہ إلی اللہ وصار فی التعارف اسما للنسیکۃ التی ھی الذبیحۃ.

قربانی وہ چیز ہے جس کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کیا جائے، اصطلاح شرع میں یہ قربانی جانور ذبح کرنے کا نام ہے۔

اس تعریف سے واضح ہوتا ہے کہ قربانی کا اصل مقصد اللہ کا قرب حاصل کرنا ہے اور یہ محض ایک رسمی عمل نہیں بلکہ خلوص، تقویٰ اور اطاعت کا مظہر ہے۔ قرآن پاک میں قربانی کے حوالے سے اللہ تبارک وتعالی نے ارشاد فرمایا:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ۔ (الحج،۲۲: ۳۴)

اور ہم نے ہر امت کے لئے ایک قربانی مقرر کر دی ہے تاکہ وہ ان مویشی چوپایوں پر جو اللہ نے انہیں عنایت فرمائے ہیں (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیں۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سنت ہے جو خالص اطاعت و تسلیم کی علامت ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ (الصافات:۱۰۳)

" پھر جب دونوں (رضائے الٰہی کے سامنے) جھک گئے (یعنی دونوں نے مولا کے حکم کو تسلیم کرلیا) اور ابراہیم (علیہ السلام) نے اسے پیشانی کے بل لِٹا دیا۔"

یہ آیت اطاعت و تسلیم کے اس مثالی اور بے نظیر منظر کو بیان کرتی ہے جہاں اللہ کے خلیل، حضرت ابراہیم علیہ السلام، اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کے حکم پر قربان

کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ منظر صرف ایک والد کی طرف سے بیٹے کی قربانی کا واقعہ نہیں بلکہ ایمان، قربانی، وفاداری اور خالص بندگی کا اعلیٰ ترین مظاہرہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں اللہ کا حکم پایا اور بغیر کسی تردد کے اسے حقیقت میں بدلنے کے لیے کمربستہ ہو گئے، جبکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام، جو ابھی سنِ بلوغ کو ہی پہنچے تھے، بخوشی، بغیر کسی جھجک کے، اپنے آپ کو اللہ کے راستے میں پیش کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے عرض کیا:

يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللهُ مِنَ الصَّابِرِينَ۔ (الصافات ۳۷: ۱۰۲)

ابّاجان! وہ کام (فوراً) کر ڈالیے جس کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔

یہ صرف جسمانی قربانی کا واقعہ نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم تر حقیقت ہے۔ یہ قربانی جان سے بڑھ کر تھی، یہ نفس کی قربانی تھی، خواہشاتِ نفس کو اللہ کے حکم کے تابع کرنے کا مظاہرہ تھا اور دنیاوی محبتوں، خصوصاً اولاد کی محبت کو اللہ کی محبت پر قربان کرنے کا عملی اظہار تھا۔

یہ واقعہ ہمیں سکھاتا ہے کہ قربانی صرف ذبح کا نام نہیں بلکہ دل کی وہ کیفیت ہے جہاں انسان اپنی تمام تر وابستگیوں کو اللہ کی رضا پر قربان کرنے کو تیار ہو جائے۔ یہی وہ حقیقی روحِ قربانی ہے جسے قرآن نے اس مثالی واقعے کے ذریعے ہمارے سامنے رکھا ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ما عمل آدمي من عمل يوم النحر أحب إلى الله من إهراق الدم۔ (سنن الترمذی)

”عید قربان کے دن آدمی کا سب سے محبوب عمل اللہ کے نزدیک خون بہانا ہے۔“

یہ حدیث قربانی کے عمل کی فضیلت، عظمت اور روحانی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ عیدالاضحی کے دن جب مسلمان اللہ کے حکم کی تعمیل میں جانور قربان کرتے ہیں، تو یہ محض ایک رسم یا ثقافتی مظاہرہ نہیں ہوتا، بلکہ یہ عمل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب سے محبوب عبادت قرار دیا گیا ہے۔

قربانی: قربتِ الٰہی کا ذریعہ

قربانی کا مقصد صرف جانور ذبح کرنا نہیں، بلکہ یہ عمل انسان کو ایک عظیم پیغام

دیتا ہے کہ جب اللہ کی رضا کا معاملہ درپیش ہو، تو انسان کو ہر چیز قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ چاہے وہ مال ہو، جسے ہم اپنی محنت سے کماتے ہیں، یا وقت ہو، جو ہماری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے، یا پھر نفس کی خواہشات ہوں، جو اکثر ہمیں اللہ کی رضا سے دور لے جاتی ہیں۔

قربانی ہمیں سکھاتی ہے کہ اللہ کی رضا سب سے مقدم ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سنت سے ہمیں ورثے میں ملا ہے۔ قربانی کا دن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ایمان، اطاعت اور اخلاص ہی وہ بنیادی اصول ہیں جو ایک مؤمن کی زندگی کا رخ متعین کرتے ہیں۔

لہٰذا، قربانی کے عمل کو صرف ایک تہوار نہ سمجھا جائے، بلکہ اسے اپنی روح کی تربیت، نفس کی اصلاح اور اللہ سے قربت کا ذریعہ بنایا جائے تاکہ ہم نہ صرف ظاہری طور پر، بلکہ باطنی طور پر بھی اس عظیم عبادت کا حق ادا کر سکیں اور اس کی روح تقوی کو پا سکیں، جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

لَنْ يَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (الحج، ۲۲: ۳۷)

ہر گز نہ (تو) اللہ کو ان (قربانیوں) کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون مگر اسے تمھاری طرف سے تقوی پہنچتا ہے۔

سو اس ساری بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حج اور قربانی کا سب سے اہم مقصد اپنی ہوائے نفس کو مارنا اور اسے ذبح کرنا ہے جسے تقوی کا نام دیا جاتا ہے، اور تقوی ہی اصل کامیابی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا۔ (الشمس: ۹۔۱۰)

”بیشک وہ شخص فلاح پا گیا جس نے اس (نفس) کو (رذائل سے) پاک کر لیا (اور اس میں نیکی کی نشو و نما کی)۔ اور بیشک وہ شخص نامراد ہو گیا جس نے اسے (گناہوں میں) ملوث کر لیا (اور نیکی کو دبا دیا)۔“

خلاصۂ کلام

حج کے تمام مناسک اور قربانی کا عمل، انسان کو اپنے نفس کا محاسبہ سکھاتے ہیں۔ وہ انا، غرور، لالچ، خود پسندی اور دنیاوی وابستگیوں کو چھوڑ کر اللہ کے قریب ہونے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حج

ایک مدرسہ ہے اور قربانی اس کی عملی مشق۔ اگر ان دونوں عبادات سے انسان کا دل نہ بدلے تو وہ رسم تو ہو گی، روح نہیں۔

اسی طرح دین اسلام انفرادی عبادات کے ساتھ اجتماعی بھلائی پر بھی زور دیتا ہے۔ حج کے دوران اجتماعیت، قربانی کے گوشت کی تقسیم، حج کے سفر میں دوسروں کی مدد، یہ سب خدمت خلق کے جذبے کو جِلا دیتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

خَيْرُ النَّاسِ أَنفَعُهُمْ لِلنَّاسِ۔ (المعجم الاوسط)

''بہترین انسان وہ ہے جو لوگوں کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش ہو۔''

قربانی کے گوشت کی تقسیم کا حکم بھی اسی خدمتِ خلق کا مظہر ہے:

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ۔ (الحج:۳۶)

''تو تم خود (بھی) اس میں سے کھاؤ اور قناعت سے بیٹھے رہنے والوں کو اور سوال کرنے والے (محتاجوں) کو (بھی) کھلاؤ۔''

آج کے دور میں جب غربت، افلاس، بے حسی اور طبقاتی تقسیم عام ہے، قربانی کا یہ درس ہمیں غریبوں، مسکینوں اور حاجت مندوں کے ساتھ محبت، ایثار اور سخاوت کا رویہ اپنانے کی دعوت دیتا ہے۔ آج کا انسان مادّہ پرستی، انانیت، اور روحانی خلا کا شکار ہے۔ ایسے میں حج اور قربانی جیسے شعائر ہمیں دوبارہ فطرت کی طرف بلاتے ہیں، جہاں ہم اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر دوسروں کی بھلائی کے لیے جیتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا:

دلِ مردہ دل نہیں ہے، اِسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمّتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

یعنی دل کی زندگی، تزکیہ نفس اور خدمتِ خلق میں ہے، اور یہی حج و قربانی کا حقیقی پیغام ہے۔ آج کے دور میں جب انسانیت مختلف چیلنجز کا سامنا کر رہی ہے، حج اور قربانی کی روح کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا از حد ضروری ہے۔ یہ عبادات ہمیں سکھاتی ہیں کہ ہم اللہ کی رضا کے لیے اپنی خواہشات کو قربان کریں اور دوسروں کی خدمت کریں۔ حج اور قربانی صرف عبادات نہیں بلکہ روحانی تربیت اور سماجی فلاح کے عظیم ذرائع ہیں۔ ان کی روح کو سمجھ کر عمل کرنا ہی ہمارے لیے دنیا و آخرت میں کامیابی کا ذریعہ ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ
حکمرانوں کیلئے قابلِ تقلید اُسوہ

یومِ شہادت یکم محرم الحرام کی مناسبت سے خصوصی تحریر

میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں پڑھتا ہوں تو دل جھوم اٹھتا ہے۔ اس مطالعہ سے جذبات کو مہمیز لگتی ہے اور ہمت کو جولانی ملتی ہے۔ یہ انسان کتنا عظیم تھا! دل کی بہادری اور طبیعت کی سختی کے ساتھ رقتِ قلب اور رحمدلی بھی انتہا درجے کی! یہ کیسا حسین امتزاج تھا کہ سختی میں صلابت تھی مگر سنگدلی نہیں۔۔۔ نرمی میں رحم و محبت تھی مگر ضعف و بزدلی کا شائبہ بھی نہ تھا۔۔۔ حکمت تھی تو ایسی کہ اسے خدا کی طرف سے خصوصی عطا ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔۔۔ بصیرت و ذہانت کا یہ درجہ تھا کہ حالات کو دیکھ کر ٹھیک ٹھیک نتائج اخذ کر لیتے تھے۔۔۔ نہ تعریف سے ریشہ خطمی ہوتے نہ تنقید سے مشتعل۔۔۔ حق کا ساتھ دیتے اور اس کے سامنے سر جھکا دیتے۔ انسان کی قدر و منزلت کیسے بلند ہوتی اور اس کی شان کیونکر پست ہو جاتی ہے؟ اس سوال کا جواب حضرت عمر رضی اللہ عنہ بخوبی جانتے تھے۔ انسانیت کو سربلند کرنے کے لیے ہر کام کیا اور انسانوں کی ذلت کا ہر راستہ بند کر دیا۔

ذیل میں آپ رضی اللہ عنہ کی شخصیت کے چند گوشوں کو بیان کیا جارہا ہے:

مردم شناسی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ مردانِ کار کی قابلیت کا صحیح اندازہ لگاتے تھے اور مناسب لوگوں کو مناصب عطا فرماتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے نزدیک اہم چیز کام تھا نہ کہ افراد۔ جو شخص کسی کام کو اچھی طرح سے سرانجام دے سکتا ہو، اس کا انتخاب کر لینا چاہیے خواہ اس سے آپ کا تعارف ہو یا نہ ہو۔ تعلقات،

جذبات اور ذاتی مصلحتیں تو بدلتی رہتی ہیں مگر اقدار اپنی جگہ قائم رہتی ہیں۔ اسلام میں بنیادی قدر یہ ہے کہ کسی شخص کو ذمہ داری سونپتے وقت اس کی قابلیت اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے اس کی خدمات کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ یہ اصول اپنانے سے معاملات ٹھیک چلتے ہیں اور کوئی کدورت پیدا نہیں ہوتی۔ ذاتی تعلقات کا انکار نہیں کیا جاسکتا مگر دیرپا چیز انسان کے اعمال اور کردار ہیں۔ جنہیں ہم گمنام سمجھتے ہیں وہ اللہ کے نزدیک قابلِ قدر ہوتے ہیں۔

نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ کا ایک ایلچی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس سے لوگوں کے حالات پوچھے۔ اس نے کہا: ”فلاں فلاں تو شہید ہوگئے ہیں اور بہت سے دوسرے بھی میدان میں کام آگئے ہیں جن کو ہم نہیں جانتے۔“ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”تم جانو یا نہ جانو، اللہ تو جانتا ہے۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ کی راہ میں کام کرنے والے لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ بھی ہوں تو انہیں کوئی غم نہیں ہوتا اور نہ اس گمنامی سے انہیں کوئی نقصان ہی پہنچتا ہے۔

حقیقت میں انسانوں کی قدر و قیمت اللہ کی نظروں میں ہونی چاہیے اور وہ سب کچھ جانتا ہے۔ مخلوق کے علم میں کسی کے کارنامے آبھی جائیں تو اس سے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ نہیں ہو سکتا اور چھپے رہیں تو اس سے اس کا اجر ضائع نہیں ہوتا۔ کتنے ہی گمنام مخلص لوگ ہوتے ہیں جن کے بال بکھرے ہوئے اور جسم گرد آلود نظر آتے ہیں۔ لوگوں کی نگاہوں میں ان کی کوئی قدر نہیں ہوتی مگر اللہ کے ہاں ان کا یہ مقام ہوتا ہے کہ اگر وہ قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو جھوٹا نہیں ہونے دیتا۔

میں اگر یہ کہوں کہ دنیا بھر میں گمنام سپاہی کا جو تصور پایا جاتا ہے، اس کی بنیادی فکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دی تھی تو اس میں مبالغہ نہ ہوگا کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کے اعمال کو دیکھتے تھے، بے شک وہ غیر معروف ہی کیوں نہ ہوں۔

انسانی قدر و قیمت کے پیمانے

انسانوں کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لیے ہر شخص اور ہر نظام کے اپنے اپنے پیمانے ہوتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک پیمانہ یہ تھا کہ کسی شخص نے امتِ مسلمہ کے لیے کیا خدمات پیش کی ہیں۔ اس معاملے میں آپ رضی اللہ عنہ نے اتنا عظیم الشان معیار قائم کیا کہ اس کی بدولت تمام لوگوں کو ان کا جائز مقام و مرتبہ بھی ملا اور ان کے دل بھی سکون سے مالا مال ہوئے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس میں عمرو بن طفیل رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے۔ ان کا ایک ہاتھ یمامہ کی جنگ میں کٹ گیا تھا۔ مجلس کے دوران کھانے کا وقت ہوا تو حاضرین کے لیے دستر خوان بچھ گیا اور

کھانا چن دیا گیا۔ حضرت عمرو بن طفیل ؓ ایک جانب ہٹ کر بیٹھ گئے۔ حضرت عمر ؓ نے دیکھا تو ان سے کہا: ''شاید آپ اپنے ہاتھ کی وجہ سے الگ جا بیٹھے ہیں؟'' عمرو ؓ نے جواب دیا: ''جی ہاں۔''

حضرت عمر ؓ نے اس موقع پر فرمایا:

''خدا کی قسم میں اس وقت تک یہ کھانا نہیں چکھوں گا، جب تک تم اپنے ہاتھ سے اس کو تہہ و بالا نہ کر دو۔ حاضرین میں سے تمھارے سوا کوئی بھی ایسا نہیں جس کے جسم کا کوئی حصہ جنت میں پہنچ چکا ہو۔''

حضرت عمرو بن طفیل ؓ پتہ نہیں کیوں دستر خوان سے دور جا بیٹھے تھے۔ حضرت عمر ؓ کی مجلس میں بھلا کون ان سے کراہت محسوس کر سکتا تھا۔ وہاں تو اپنے مقدس فریضوں کو ادا کرنے کے دوران زخم کھانے والوں کی انتہائی قدر کی جاتی تھی۔ یہ ایک بے نظیر مثال تھی جو انسانوں کو قربانی پر ابھارتی اور ان سے کارہائے نمایاں سرانجام دلواتی تھی۔ جس کے جسم کا کوئی حصہ راہِ خدا میں کام آجاتا تھا، اسے حقارت سے دیکھنے کی بجائے نہایت احترام کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی حضرت عمر ؓ کے قائم کیے ہوئے یہ سنگِ میل آج بھی بڑا وزن رکھتے ہیں۔

حضرت عمر ؓ لوگوں کی نفسیات سے خوب واقف تھے۔ آپ ؓ ایسے طریقے سے علاج کرتے تھے جو فائدہ مند ہو اور ان چیزوں سے اجتناب برتتے تھے جو لوگوں کے لیے مضر ثابت ہو سکتی تھیں۔ آپ کا طریقہ علاج ایسا کامل تھا کہ مذموم عادتیں ترک کر دی جاتی تھیں اور اوصافِ حمیدہ غالب آجاتے تھے۔ ہوا و ہوس کے جذبات دب جاتے تھے اور للہیت پروان چڑھتی تھی۔

مجاہدؒ بیان کرتے ہیں کہ کسی نے امیر المومنین کی خدمت میں خط لکھا اور پوچھا: ''اس آدمی کے بارے میں کیا خیال ہے جو نافرمانی کی خواہش بھی نہیں رکھتا اور اس کا ارتکاب بھی نہیں کرتا؟'' حضرت عمر ؓ نے اس کے جواب میں لکھا: ''جو لوگ نافرمانی کی خواہش رکھنے کے باوجود اللہ کے خوف کی وجہ سے اپنا دامن بچائے رکھتے ہیں انہی لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لیے چن لیا ہے۔''

لوگوں کی اکثریت خواہشاتِ نفس کی غلامی اختیار کر لیتی ہے۔ بہت کم لوگ نفس کے دھوکے اور شیطان کے ورغلانے کو سمجھتے اور اپنا مناسب دفاع کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اللہ کی توفیق سے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ حضرت عمر ؓ ایسے لوگوں کو بشارت دیا کرتے تھے کہ ان کے رب کے ہاں ان کے لیے بلند درجات ہیں۔ آپ انہیں ترغیب دلاتے کہ وہ اس کٹھن راستے پر ثابت قدمی اور دوام کے ساتھ چلتے رہیں اور متزلزل لوگوں کو آپ ؓ غیرت دلایا کرتے تھے کہ وہ برائی کی ترغیبات میں آنے کی بجائے اپنے ایمان اور پاکیزگی پر ڈٹ جائیں۔ حضرت عمر ؓ نے رسول اللہ ﷺ کے اس قول سے یہ مفہوم سمجھا تھا۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

”جو شخص کسی حرام کام کو کرنے کی قدرت رکھتا ہو مگر اسے اللہ کے خوف کی وجہ سے چھوڑ دے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس دنیا میں اس شخص کو حلال طریقے سے اس حرام چیز سے زیادہ بہتر چیز عطا فرما دیتا ہے اور آخرت کا ثواب تو بدرجہا اعلیٰ وارفع ہے۔“

قربانیاں دینے والے دلوں میں زندہ رہیں

انسانی زندگی میں اخلاص اور باہمی محبت و مودّت کا بڑا مقام ہے۔ انسانوں کی قدر و قیمت اور ان کے کارناموں کی تحسین وہی کر سکتے ہیں جو حساس ذہن اور دردمند دل رکھتے ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب کو مشہور سپہ سالار اور صحابیِ رسول ﷺ حضرت نعمان رضی اللہ عنہ بن مقرن کی شہادت کی اطلاع ملی تو آپ کو بڑا صدمہ پہنچا۔ نعمان رضی اللہ عنہ کی خدمات اور دشمنوں کے مقابلے پر قابلِ فخر کارنامے ان کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ وہ مسجدِ نبوی میں منبرِ رسول پر چڑھے، آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور چہرے سے غم اور حزن نمایاں تھا۔ دیکھنے والے بھی رونے لگے اور مسجد نبوی میں موجود ہر شخص اشک بار ہو گیا۔

بظاہر یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے جسے عمر رضی اللہ عنہ کے سیرت نگاروں نے لکھا ہے مگر اس کے پیچھے ایک بہت بڑی حقیقت جلوہ گر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دنیا کو بتا دیا کہ کارنامے سرانجام دینے والے سربکف مجاہدوں کو محض الفاظ کا خراج یا کسی انعام واکرام اور تمغے کا اعزاز ان کی خدمات کا حقیقی اعتراف نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے لیے دل میں مقام و مرتبہ ہونا چاہیے۔ موت اور قبر کی مٹی کی تہیں انہیں ظاہری طور پر تو ہم سے دور کر دیتی ہیں مگر ہمارے دلوں میں وہ زندہ رہتے ہیں۔ ایسے حکمرانوں کے ساتھ ان کے ماتحتوں کا معاملہ رسمی نہیں ہوتا بلکہ براہِ راست دلوں سے دل جڑے ہوتے ہیں۔

ادائیگی فرض کا لطف اور جوابدہی کا احساس

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بطور حاکم اپنے فرائض کی ادائیگی میں سرگرم عمل رہتے تھے۔ بہت سے نیک نفس حکمران اور بھی ہیں جو اپنے واجبات کی ادائیگی کا اہتمام کرتے تھے اور آج بھی اگر کوئی حکمران سنجیدگی سے کمرِ ہمت باندھ لے تو یہ کام کر سکتا ہے مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس معاملے میں کمال یہ ہے کہ وہ ان فرائض کی ادائیگی میں لطف محسوس کرتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ عبادت کا حصہ تھا۔ رعایا کے لیے جذباتِ محبت اور نیکی کے کاموں کے لیے ہمیشہ کمربستہ رہنا، ان کی شان تھی۔ انھوں نے خلافت کا بھاری بوجھ جس کے اٹھانے سے پہاڑ عاجز تھے، اٹھایا اور اس کا حق ادا کر دیا۔ اس بوجھ کے باوجود وہ دوسروں کا بوجھ کم کرنے اور اپنے اوپر زیادہ بوجھ لادنے کی فکر میں رہتے تھے۔ حقداروں کے پاس پہنچ

کران کا حق ادا کیا کرتے تھے۔ وہ راتوں کو گلی کوچوں میں گھوم پھر کر لوگوں کے حالات معلوم کرتے اور ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنے کندھوں پر بوجھ اٹھایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ خود رجسٹر اٹھائے بنو خزاعہ کے پاس قدید پہنچے اور ان کے وظیفے انہیں دیتے ہوئے فرمایا: ''یہ ان کا حق ہے۔ انہیں اپنا یہ حق وصول کر کے اتنی خوشی نہیں ہوئی ہوگی جتنی خوشی مجھے ادا کر کے ہو رہی ہے۔ تم لوگ میری تعریف نہ کرو۔ میں نے کیا تیر مارا ہے بس اپنا فرض ادا کیا ہے۔''

یہ عظمتِ کردار کہاں مل سکتی ہے؟ سربراہِ مملکت اپنی پیٹھ پر سامان لادے لوگوں تک پہنچتا ہے اور نہ کوئی اعلان ہوتا ہے اور نہ تشہیر، نہ سپاسنامہ اور نہ قصیدہ خوانی۔ وہ اللہ کے سامنے حاضری اور جوابدہی کے احساس سے مالامال تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ بندوں کے معاملے میں اللہ نے ان پر کیا کچھ واجب کر رکھا ہے۔

آج صورتِ حال یہ ہے کہ حقدار بے چارے جوتیاں چٹخاتے رہتے ہیں اور پوری زندگی اپنے جائز حقوق کے حصول اور دادرسی کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔ کبھی کوئی حق مل جاتا ہے ورنہ اکثر ان لوگوں کے حصے میں حرماں نصیبی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ حکومتی اداروں کو چلانے والوں کے دلوں میں اگر خوفِ خدا پیدا ہو جائے تو ہر حقدار کو اس کا حق مل سکتا ہے مگر ایسا نہیں ہوتا۔ کیوں؟ اس کا جواب آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ حقیقت واضح ہے کہ خدا کا خوف دلوں میں نہیں ہے مگر اس کا اظہار کوئی نہیں کر سکتا کیونکہ ''نازک مزاجِ شاہاں تابِ سخن ندارد۔''

وقت: ایک قیمتی اثاثہ

حضرت عمرؓ اپنی رعایا کے ہر معاملے میں اسی طرح دلچسپی لیتے تھے، جس طرح والدین اپنی اولاد کے جملہ امور کی نگرانی کرتے ہیں۔ آپؓ اس بات کا بھی خیال رکھتے تھے کہ لوگ اپنے وقت کا استعمال کس طرح کرتے ہیں۔ کبھی آپؓ انہیں پیار محبت سے سمجھاتے اور کبھی درہ لہرا کر انہیں تاکید کرتے تھے۔ رات کو دیر تک جاگتے رہنا آپ کو ناپسند تھا۔ آپؓ لوگوں کو حکم دیا کرتے تھے کہ جلد سونے کی عادت ڈالیں تاکہ جلد اٹھ سکیں اور اگر توفیق مل جائے تو تہجد کی سعادت حاصل کر سکیں۔ آپؓ کی خلافت میں فضول کاموں اور عبث باتوں کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ آپؓ جانتے تھے کہ وقت بہت قیمتی متاع ہے اور کام بے شمار ہیں جن کی تکمیل کے لیے وقت کا ایک ایک لمحہ احتیاط سے استعمال میں لانا چاہیے۔ اگر لوگ عشاء کی نماز کے بعد کہانی قصے سننے سنانے کے لیے بیٹھ جاتے تو حضرت عمرؓ کو سخت ناگوار گزرتا۔ آپؓ انہیں سرزنش فرماتے اور کہتے: ''پہلی رات کہانی قصوں کی نذر کر دیتے ہو اور پچھلی رات لمبی تان کر سو جاتے ہو۔ عشاء کے بعد کراماً کاتبین کو بھی ذرا آرام کرنے دیا کرو۔''

اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ کائنات میں بڑی حکمت اور اپنے بندوں کے مفاد کو ملحوظ رکھا ہے۔ وہ بندوں کے نفع و نقصان کو خوب جانتا ہے۔ اس نے دن کو کام کاج اور تلاشِ معاش کے لیے اور رات کو آرام و راحت کے لیے پیدا کیا ہے۔ رات کو جلد سو جانے والا شخص اگلے دن اپنے کاموں میں پوری چستی اور نشاط کے ساتھ علی الصباح مشغول ہو جاتا ہے۔ نہ اس پر سستی اور کاہلی کا غلبہ ہوتا ہے اور نہ وہ اونگھتا ہے۔ راتوں کو لمبی محفلیں جما کر بیٹھے رہنا انسان کے لیے ہر لحاظ سے نقصان دہ ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ عشاء کی نماز سے قبل سونے اور عشاء کے بعد باتیں کرنے کو ناپسند فرمایا کرتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب لوگوں کو یہ حکم دیا کہ رات کو جلد سو جایا کریں تو ان کے پیش نظر یہی حدیث رسول اور حکم ربانی تھا جو سورۃ المزمل کی آیت ۶ میں دیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا: ”بے شک (پچھلی) رات کو اٹھنا (اور عبادت میں مصروف ہو جانا) نفس امارہ کو کچلنے اور صحیح اور سچی بات کہنے کی عادت ڈالنے کے لیے بہت مفید ہے۔“

رات کی خاموشی اور تنہائی میں اللہ کی اطاعت و عبادت کا جو لطف آتا ہے وہ ناقابلِ بیان ہے۔ سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ خاموش فضا میں دل و دماغ، آنکھیں اور کان، سوچ اور دھڑکن ہر چیز اللہ کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ رات کی سیاہ زلفیں خشوع و خضوع سے دل کو بھر دیتی ہے اور رکوع و سجود، قیام و قعود، دعا و مناجات، ہر مرحلہ کیف و سرور سے مالا مال کر دیتا ہے۔

حضرت عمرؓ نوجوانوں کے اندر قوت و صحت اور زندگی و مردانگی کے آثار دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلم نوجوان ظاہر و باطن ہر لحاظ سے اسلام کی شوکت و قوت کا مظہر بن جائیں۔ ایک نوجوان کو مریل چال چلتے ہوتے دیکھا تو پوچھا: ''کیا تم بیمار ہو؟'' اس نے کہا: ''نہیں، امیر المومنین میں بالکل تندرست ہوں۔'' اس پر آپؓ نے درہ لہرایا اور فرمایا: ''پھر یہ مردنی تم پر کیوں چھائی ہوئی ہے۔ جوانمردوں کی طرح چلو۔''

حضرت عمرؓ اپنی رعایا کے ہر خاص و عام کو تذکیر و نصیحت کرتے رہتے تھے۔ امہات المومنینؓ کا مقام و مرتبہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ حضرت عمرؓ نے نماز پڑھاتے ہوئے سورہ احزاب کی تلاوت کی اور ان آیات پر پہنچے جن میں رب العزت نے آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنھن کو یا نساء النبی کہہ کر خطاب کیا ہے تو آواز بلند ہو گئی۔ نماز کے بعد لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو بتایا کہ امہات المومنین رضی اللہ عنھن کو وہ عہد یاد دلانا مقصود تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے خصوصی طور پر نازل فرمایا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ مومن مرد اور مومن عورتیں تذکیر اور یاددہانی سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ تذکیر کا اہلِ ایمان کو فائدہ ہوتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

''نصیحت کیا کرو۔ بے شک نصیحت سے اہلِ ایمان کو نفع پہنچتا ہے۔'' (الذاریات: ۵۵)

دینِ اسلام کی وسیع الظرفی

دین آسانی کا داعی ہے۔ اس کا مقصد لوگوں کے لیے تنگی پیدا کرنا نہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے وضو کرنا چاہا مگر کہیں سے پانی نہ مل سکا۔ ایک عیسائی عورت کے پاس پانی تھا، آپؓ نے بلا کراہت اس کے گھڑے میں سے پانی لیا اور وضو کر لیا۔ اس نصرانی عورت پر امیر المومنین کے اس عمل کا بڑا مثبت اثر پڑا۔ اس نے سوچا کہ امیر المومنین نے اسے نصرانی ہونے کی وجہ سے نجس اور ناپاک نہیں سمجھا اور نہ اس کے بارے میں کوئی مذہبی تنگ نظری اور تعصب ہی دکھایا ہے۔

حضرت عمرؓ بعض شعبوں میں مسلمان افسروں کے ساتھ عیسائی اور یہودی افسروں کو بھی ذمہ داریاں سونپ دیا کرتے تھے۔ خصوصاً جبکہ اس خاص شعبے کے لیے مسلمانوں کے اندر موزوں افراد نہ مل سکتے ہوں۔ یہ عہدے عموماً مالیات کے شعبے میں ہوتے تھے البتہ انتظامی اور کلیدی مناصب پر مسلمانوں ہی کو متعین کیا جاتا تھا۔ صحیح مسلم میں ایک حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہودی اور عیسائی ذمیوں سے سرکاری خدمات لی جا سکتی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ابو یزید طائی کو اپنی قوم کے صدقات اور زکوٰۃ وصول کرنے کی ذمہ داری سونپی تھی حالانکہ وہ عیسائی تھا۔

لایعنی مباحث سے اجتناب

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فضول کاموں اور لغو مشغلوں کو ہر گز پسند نہ کرتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ ہر اس کام کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے جو مفید اور نتیجہ خیز ہو جبکہ لایعنی افعال پر سرزنش فرمایا کرتے تھے۔ مسلمان کی زندگی بامقصد ہے، اس لیے اس کا کوئی لمحہ بھی بلا مقصد نہیں گزرنا چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ عراق سے ایک شخص مدینہ آیا ہے جو قرآن مجید کے متشابہات کے بارے میں سوال جواب کی محفلیں سجاتا ہے اور لوگوں کے ذہن ان مباحث کے نتیجے میں پراگندہ ہو رہے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اسے منع کیا مگر اس نے اپنا مشغلہ جاری رکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے پاس بلایا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے کھجور کی دو تازہ چھڑیاں تیار کر لیں۔ وہ آیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''تم کون ہو؟'' اس نے کہا: ''میں اللہ کا بندہ ہوں اور میرا نام صبیغ بن عسل ہے۔'' آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں اللہ کا بندہ عمر بن خطاب ہوں۔'' پھر چھڑی اٹھائی اور اس کی خوب مرمت کی۔ اس نے مار کھانے کے بعد کہا: ''امیر المومنین! اب بس کیجیے۔ میرے سر میں جو خناس تھا، اب نکل گیا ہے۔ میں اب ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اسے مدینہ سے جلاوطن کر کے بصرہ بھیج دیا۔

آج امتِ مسلمہ کا حال ملاحظہ کیجیے۔ آزادیٔ فکر کے نام پر کئی نام نہاد مفکرین لوگوں کے ایمان و عقیدہ پر ڈاکے ڈال رہے ہیں۔ یہ چبا چبا کر باتیں کرنے والے فلاسفر اور اداباز بڑی عیاری سے ہماری ایمانی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ ایسے ایسے مباحث میں نوجوانوں کو الجھاتے ہیں، جن سے ان کا ایمان

متزلزل ہو جائے۔ ان لوگوں کو کھلی چھٹی ہے۔ نہ ان پر قدغن ہے، نہ ان کی ہرزہ سرائی پر پابندی، یہ صورتِ حال اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

خلاصۂ کلام

حضرت عمر ؓ کی سیرت کا مکمل احاطہ اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ حضرت عمر ؓ نے جو کچھ کر دکھایا وہ آپ ؓ کے سوا کسی دوسرے کے بس میں نہ تھا۔ آپ ؓ نے امتِ مسلمہ کی خوش بختی اور کامیابی کا ایسا انتظام کیا تھا جو تاریخ انسانی میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس عظیم مقام کے باوجود حضرت عمر ؓ کی انکساری کا یہ عالم تھا کہ اکثر کہا کرتے تھے:

''کاش! میرے کندھوں پر یہ بوجھ نہ ڈالا جاتا۔''

کبھی کبھار آپ کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا گیا: ''اے کاش میری ماں نے مجھے جنا ہی نہ ہوتا۔''

آپ احکم الحاکمین کے سامنے روزِ حشر کی حاضری کے تصور ہی سے کانپ اٹھتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ ؓ نے یہ بھی فرمایا:

''خلافت کی ذمہ داری اٹھانا میرے نزدیک اتنا مشکل اور کٹھن کام ہے کہ اگر کوئی میری گردن مار دیتا تو اس بوجھ کے مقابلے میں میرے لیے وہ آسان ہوتا۔'' شہادت کے وقت فرمایا:

''جو بھی میرے بعد خلیفہ مقرر ہو جائے، وہ جان لے کہ اس خلافت کے کام میں شدت کی ضرورت ہے مگر اس شدت میں جبروت نہیں ہونی چاہیے اور اس کام میں نرمی کی ضرورت ہے مگر اس نرمی میں کمزوری کا اظہار نہیں ہونا چاہیے۔''

حضرت عمر ؓ نے ایک حکمران کے طور پر ایسا مکمل نمونہ پیش کیا کہ آج تک آپ ؓ منصف حکمرانوں کے لیے قابلِ تقلید اسوہ ہیں۔ حضرت عمر ؓ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی بے پناہ نعمتوں سے نوازا تھا۔ وہ اسی خاک اور مٹی سے پیدا ہوئے تھے مگر ان کی روح بہت عظیم، جامع اور کامل تھی۔ ہمارے لیے آپ ؓ کی سیرت میں تربیت اور درس و عبرت کے بے شمار پہلو ہیں۔ وہ ہدایت یافتہ لوگوں میں سے تھے اور اللہ نے ایسے ہی لوگوں کی اقتداء کا حکم دیا ہے۔

مصر کے مشہور عالمِ دین علامہ عمر تلمسانیؒ کی کتاب ''شہید المحراب: عمر بن الخطاب ؓ'' سے ماخوذ

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی حیا و بردباری معاشرتی اصلاح کا ذریعہ

یوم شہادت ۱۸، ذوالحج کی مناسبت سے خصوصی مضمون

ڈاکٹر محمد اظہر عباسی

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو نہ صرف عبادات بلکہ اخلاقیات، معاملات اور معاشرتی رویوں کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ دینِ اسلام کی تعلیمات کا مرکزی محور انسانی کردار کی تعمیر اور معاشرتی اصلاح ہے۔ اسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا اور ان کے سیرت و کردار کو انسانیت کے لیے نمونہ قرار دیا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا ایک اہم مقصد اخلاقی تربیت تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دین اسلام کی تعلیمات کو عملی شکل دی۔ بالعموم جملہ صحابہ کرام اور بالخصوص خلفاء راشدین کی زندگیاں قرآن و سنت کی بیان کردہ اخلاقی تعلیمات کی آئینہ دار تھیں۔ ان میں سے ایک نمایاں ہستی تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ جاہ و حشمت کے مالک، شیریں کلام اور شرم و حیا کے پیکر تھے۔ ایسے نیک فطرت کہ نہ قبل از اسلام کسی بت کو سجدہ کیا اور نہ کبھی شراب کی طرف مائل ہوئے۔ آپ خود فرماتے ہیں:

ما تغنیت ولا تمنیت، ولا مسست ذکری بیمینی منذ بایعت بها رسول الله صلی الله علیه وسلم، ولا شربت خمراً فی جاهلیة ولا فی إسلام، ولا زنیت فی جاهلیة ولا فی إسلام۔

(سیوطی، جلال الدین، تاریخ الخلفاء، ص: ۲۴۳)

میں نے کبھی گیت نہیں گایا، نہ کسی چیز کی تمنا کی اور جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر ہاتھ رکھ کر بیعت کی ہے تب سے اپنے دائیں ہاتھ سے اپنی شرمگاہ کو نہیں چھوا، زمانہ جاہلیت میں بھی اور قبولِ اسلام کے بعد بھی کبھی شراب نوشی نہیں کی اور نہ زنا کیا۔

آپ رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں دو صفات؛ حیا اور بردباری بہت نمایاں تھیں۔ دورِ حاضر میں جہاں بے حیائی اور عدم برداشت عام ہو چکی ہے، وہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سیرت سے رہنمائی حاصل کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

حیا: باطنی حسن کا مظہر

اسلام میں اخلاقی صفات کو انتہائی اہم مقام حاصل ہے، خصوصاً حیا (شرم و حجاب) اور بردباری (حلم و صبر) کو انسان کے باطنی حسن کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ان صفات کا نہ صرف تذکرہ کیا گیا ہے بلکہ ان کی اہمیت کو واضح کر کے مومنین کو ان پر عمل کی تاکید بھی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ۔ (سورہ النور، جل جلالہ ۲: ۳۰)

”(اے نبی!) مومن مردوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے۔“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

والحياء شعبةٌ من الإيمان۔

(صحیح بخاری، کتاب الایمان، رقم الحدیث: ۹)

”حیا ایمان کا ایک شعبہ ہے۔“

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غنی کی ذات ان تعلیمات کی عملی تصویر تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

أَشَدُّ أُمَّتِي حَيَاءً عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ۔

(أبو نعیم، حلیۃ الأولیاء، ۱: ۵۶)

”میری امت میں سب سے زیادہ حیادار عثمان بن عفان ہیں۔“

ان کا لباس، نشست و برخاست، گفتگو، حتیٰ کہ نبی ﷺ کے سامنے بیٹھنے کا انداز بھی انتہائی محتاط اور باوقار ہوتا۔ حیا ان کی زندگی کا مرکزی اصول تھا۔ کامل الحیاء والایمان کا لقب بھی صرف آپ رضی اللہ عنہ ہی کے شایانِ شان ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ میرے گھر میں بستر پر لیٹے ہوئے تھے، اس عالم میں کہ آپ ﷺ کی دونوں مبارک پنڈلیاں کچھ ظاہر ہو رہی تھیں، حضرت ابو بکر نے آنے اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے اجازت دے دی اور آپ ﷺ اسی طرح لیٹے رہے اور گفتگو فرماتے رہے۔ پھر حضرت عمر ؓ نے آنے اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے اجازت دے دی جبکہ آپ ﷺ اسی طرح لیٹے رہے اور گفتگو فرماتے رہے۔ پھر حضرت عثمان ؓ نے آنے اجازت طلب کی تو حضور نبی اکرم ﷺ اٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنے کپڑے درست کر لئے۔ حضرت عثمان آکر باتیں کرتے رہے۔

جب وہ چلے گئے تو حضرت عائشہ صدیقہ ؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! حضرت ابو بکر ؓ آئے تو آپ نے ان کا فکر و اہتمام نہیں کیا، حضرت عمر ؓ آئے تب بھی آپ نے کوئی فکر و اہتمام نہیں کیا اور جب حضرت عثمان ؓ آئے تو آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنے کپڑے درست کر لئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

أَلَا أَسْتَحِيِ مِنْ رَجُلٍ تَسْتَحِيِ مِنْهُ الْمَلَائِكَةُ.

(مسلم في الصحيح، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عثمان بن عفان، ۴: ۱۸۶۶)

”میں اس شخص سے کیسے حیاء نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیاء کرتے ہیں۔“

اخلاقِ عالیہ، صفاتِ حمیدہ، عاداتِ شریفہ اور خصائلِ کریمہ آپ ؓ کے خمیر میں شامل تھے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

فَإِنَّهُ مِنْ أَشْبَهِ أَصْحَابِيِ بِيِ خُلُقًا۔

”بے شک عثمان میرے صحابہ میں سے خُلق کے اعتبار سے سب سے زیادہ میرے مشابہ ہے۔“ (طبرانی، المعجم الکبیر، ۱/۷۶)

حضرت عثمان ؓ نے اپنی پوری زندگی اس خصلت کو نہ صرف اپنایا بلکہ ایسی مثالیں قائم کیں جو رہتی دنیا تک مشعلِ راہ بن چکی ہیں۔ حضرت عثمان بن عفان ؓ وہ واحد شخصیت ہیں جنہیں "ذوالنورین" یعنی "دونوروں والے" کا لقب ملا، کیونکہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی دو صاحبزادیوں سے نکاح کیا۔ پہلے حضرت رقیہ ؓ سے اور پھر ان کے انتقال کے بعد حضرت ام کلثوم ؓ سے نکاح کیا۔ حضرت علی ؓ نے فرمایا:

ذَاكَ امْرُؤٌ يُدْعٰى فِي الْمَلَإِ الْأَعْلٰى ذَا النُّوْرَيْنِ.

(ابن حجر العسقلانی، الاصابۃ، ج: ۴، ص: ۴۵۷)

حضرت عثمان ؓ ایسی عظیم الشان ہستی ہیں کہ جنہیں آسمانوں میں ذوالنورین کہا جاتا ہے۔

یہ نبی کریم ﷺ کا حضرت عثمان ؓ پر غیر معمولی اعتماد اور محبت کا اظہار تھا۔ ان دونوں نکاحوں کے پیچھے حضرت عثمان ؓ کی دینداری، تقویٰ اور حیا کا بڑا کردار تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَوْ كَانَ عِنْدِي ثَالِثَةٌ لَزَوَّجْتُهَا عُثْمَانَ

(الطبقات الکبریٰ لابن سعد، ج: ۳، ص: ۴۱)

''اگر میرے پاس تیسری بیٹی ہوتی تو میں اسے بھی عثمان سے بیاہ دیتا۔''

نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان حضرت عثمان ؓ کے باطنی طہارت اور اعلیٰ کردار کی گواہی ہے۔ حیا ایسی صفت ہے جو انسان کے اندرونی حسن کی عکاسی کرتی ہے اور حضرت عثمان ؓ اس صفت کی کامل تصویر تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

اللَّهُمَّ ارْضَ عَنْ عُثْمَانَ فَإِنِّي رَاضٍ عَنْهُ۔ (سنن الترمذی، کتاب الفضائل، باب فضل عثمان، رقم الحدیث: ۳۷۸۴)

اے اللہ! عثمان سے راضی ہو جا، بے شک میں اُس سے راضی ہوں۔

یہ دعا ظاہر کرتی ہے کہ حضرت عثمان ؓ کے باطن کی طہارت، ان کی حیاداری اور اخلاقی وقار کا رب العالمین کے محبوب نبی ﷺ کی نگاہ میں کیا مقام تھا۔ حضرت عثمان ؓ مجلس میں اکثر خاموش رہتے تھے اور فضول باتوں سے پرہیز کرتے۔ اگر کوئی معاملہ پیش آتا تو سوچ سمجھ کر بات کرتے، حتیٰ ان کے تقویٰ اور حیا کے سبب صحابہ کرام ؓ اُن کے مشوروں پر عمل پیرا ہوتے۔ حضرت علی ؓ فرماتے ہیں:

''ہم نے حضرت عثمان ؓ کو سب سے زیادہ حیادار اور نرم دل پایا۔''

حضرت عثمان ؓ کی حیا کوئی محدود یا وقتی رویہ نہ تھا بلکہ ان کی زندگی کا مستقل اور بنیادی جز تھا۔ ان کی ذات حیا کی چلتی پھرتی تصویر تھی۔ ان کی حیا نے نہ صرف انہیں نبی کریم ﷺ کا قرب عطا کیا بلکہ معاشرے میں بھی اصلاح کا ذریعہ بنی۔ آج کے بے حیائی سے بھرپور دور میں حضرت عثمان ؓ کی سیرت ایک مکمل رہنما ہے جو ہر فرد اور معاشرے کو پاکیزگی، پردہ، تہذیب اور اخلاق کی راہ دکھاتی ہے۔

بردباری: متوان شخصیت کی علامت

حضرت عثمان غنی ؓ کی ذات کا دوسرا نمایاں وصف حلم و بردباری تھا۔ یہ ایک اعلیٰ اخلاقی وصف ہے جسے قرآن و سنت میں نہایت پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ وہ صفت ہے جو انسان کو غصے، انتقام، اور

جذباتی رد عمل سے بچاتی ہے اور ایک متوازن شخصیت اور معاشرے کی تشکیل میں مدد دیتی ہے۔ اسلام نے سختی، غصہ، انتقام اور بدلہ کو ناپسند کیا ہے، اور حلم، بردباری اور معاف کر دینا ایمان کی علامت قرار دیا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (سورہ آل عمران، ۳: ۱۳۴)

”اور غصہ ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے (ان کی غلطیوں پر) درگزر کرنے والے ہیں، اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔“

یہ آیت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شخصیت پر مکمل طور پر صادق آتی ہے۔ انہوں نے مشکل ترین حالات میں بھی نہایت حلم، صبر اور نرمی کا مظاہرہ کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابتدائے اسلام ہی میں اسلام قبول کیا، اور ان کے اسلام لانے پر قریش کی جانب سے سخت مخالفت ہوئی۔ ان پر دباؤ ڈالا گیا، خاندانی تعلقات توڑے گئے اور انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں، لیکن انہوں نے ہر موقع پر صبر کا دامن تھامے رکھا۔ بردباری اس وقت سب سے اہم ہوتی ہے جب انسان پر ظلم ہو رہا ہو۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جوانی میں ہی حلم کی یہ صفت نمایاں ہو چکی تھی اور انہوں نے معاشرتی مخالفت کے باوجود زبان سے کوئی سخت کلمہ نہیں نکالا۔

آپ رضی اللہ عنہ سن چوبیس ہجری کی ابتداء میں مجلس شوریٰ کے انتخاب سے تیسرے خلیفہ راشد اور امیر المومنین منتخب ہوئے۔ آپ حلیم الطبع حکمران تھے، رعایا کی شکایات کو نہایت تحمل سے سنتے تھے اور پھر حتی المقدور ان کا ازالہ کرتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب خلیفہ کا عہدہ سنبھالا تو ان پر مختلف قسم کے اعتراضات ہونے لگے، حالانکہ ان کا طرز حکومت نہایت نرم، مشاورتی اور رواداری پر مبنی تھا۔ ایک شخص نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے سخت لہجے میں کہا: اے عثمان! تو نے فلاں کو کیوں عہدہ دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نہ غصہ کیا، نہ بدلہ لیا، بلکہ مسکرا کر فرمایا:

”اگر وہ تمہاری بات سے بہتر کام کرے، تو پھر تم خوش ہو جاؤ گے اور اگر میری رائے درست ثابت ہوئی تو تمہیں مجھے دعا دینی چاہیے۔“

یہ حلم کا عظیم مظاہرہ تھا۔ عام حکمران ایسے سوالات پر ناراض ہو جاتے ہیں، مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حلم اور فہم و فراست سے جواب دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بردباری آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس تعلیم کا عملی نمونہ تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ما كانَ الرِّفقُ في شيءٍ إلَّا زانَهُ، ولا نُزِعَ من شيءٍ إلَّا شانَهُ

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، رقم الحدیث: ۲۵۹۴)

نرمی جس چیز میں ہو، اسے خوبصورت بنا دیتی ہے اور جس سے نکال دی جائے، وہ چیز بدنما ہو جاتی ہے۔

عہد عثمانی کے نصف ثانی (سن 30 تا 35 ہجری) میں فتنے پیدا ہونے شروع ہوئے۔ حضرت عثمان غنی ؓ کی خلافت کے آخری دور میں سوچی سمجھی سازش کے نتیجے میں بعض لوگوں نے شورش پیدا کر دی جس سے فتنہ وفساد کا ایک سیلاب امڈ آیا۔ سیدنا عثمان ؓ عنہ پر اقرباء پروری کا الزام لگایا گیا۔ باغیوں نے مختلف گورنروں کے خلاف وہاں کی عوام سے جھوٹے خطوط لکھوا دیے کہ خلافتِ عثمانیہ کے گورنر عوام پر ظلم کرتے ہیں۔ اس پر بزرگ صحابہ کرام پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیٹی بنی جس نے متعلقہ علاقوں میں جا کر تحقیق کی مگر یہ افواہ ہر طرح سے جھوٹ ثابت ہوئی۔ حج کے موقع پر آپ ؓ کے گورنروں نے سازشیوں کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا مشورہ دیا مگر آپ ؓ نے فرمایا:

اس امت کے لیے جس فتنے کا خوف ہے وہ آ کر رہے گا، اگرچہ اس کا دروازہ سختی سے بند کر دیا جائے، لہذا میں اس دروازے کو نرمی سے بند کروں گا، البتہ حق تعالی کی حدود میں ہر گز نرمی نہیں برتوں گا۔

حضرت عثمان ؓ نے تمام زندگی اس قرآنی اصول پر عمل کیا۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ۔ (سورہ فصلت، ۴۱: ۳۴)

”برائی کو بہتر (طریقے) سے دور کیا کرو سو نتیجتاً وہ شخص کہ تمہارے اور جس کے درمیان دشمنی تھی گویا وہ گرم جوش دوست ہو جائے گا۔“

حضرت عثمان غنی ؓ نے نہ صرف اسلامی معاشرت کو حلم و بردباری کا عملی پیغام دیا بلکہ اپنے کردار سے معاشرتی اخلاقیات کو نئی جہت بخشی۔ حضرت عثمان ؓ کی خلافت کے آخری ایام میں باغی گروہ نے ان کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ باغیوں نے ان کے خلاف افواہیں پھیلائیں، بیت المال کے فیصلوں پر اعتراض کیا اور مطالبات کی فہرست پیش کی۔ حضرت عثمان ؓ نے ہر اعتراض کا جواب دیا، حتی کہ جب بات بے ادبی اور بدکلامی تک پہنچ گئی، تب بھی انہوں نے صبر کا دامن نہ چھوڑا۔ آپ کی رہائش کا چالیس روز محاصرہ رہا، آپ کو ضروریات زندگی سے محروم کر دیا گیا مگر کیا شان استغنائی تھی کہ خندہ پیشانی سے بھوک وپیاس برداشت کرتے رہے مگر صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ محاصرے کے دوران صحابہ کرام ؓ کے بار بار اجازت طلب کرنے کے باوجود آپ ؓ نے باغیوں کو کچلنے کا اذن نہ دیا۔ آپ نے فرمایا:

لا أُرِیدُ أن یُراقَ دمٌ بسببی۔

(ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج: ۷، ص: ۲۶۵)

میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی کا خون بہایا جائے۔

یہ ایک عظیم المرتبت شخص کا غیر معمولی صبر اور امت پر شفقت کا مظہر تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی جان قربان کر دی، لیکن امت میں اختلاف، قتل و غارت اور خانہ جنگی کا دروازہ کھولنا پسند نہ کیا۔ کم و بیش سات سو صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں آپ کی حفاظت پر مامور تھے اور باغیوں کو کچلنے کی اجازت طلب فرماتے رہے مگر آپ رضی اللہ عنہ فرماتے کہ میں اپنی ذات یا اپنی خلافت کی خاطر مسلمانوں کی تلواریں باہم ٹکراتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ حضرت قیس بن ابی حازم سے روایت ہے کہ ابو سھلہ رضی اللہ عنہ نے مجھے بتایا کہ حضرت عثمان نے یوم الدار (محاصرہ کے دن) کو فرمایا جب وہ محصور تھے کہ بے شک حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے ایک وصیت فرمائی تھی پس میں اسی پر صابر ہوں۔ (مسند امام احمد بن حنبل)

جب باغی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر میں گھس آئے اور انہیں شہید کرنے لگے، اس وقت بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ انہوں نے نہ کوئی بد دعا کی اور نہ چیخ و پکار کی۔ آخری وقت میں اپنے غلاموں کو بھی آزاد کر دیا اور ظلم و ستم کے تمام وار اپنی جان پر جھیلے۔ ان کے ہاتھ میں قرآن تھا، اور شہادت کے وقت ان کے خون سے قرآن کا صفحہ تر ہو گیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل ہمیں سکھاتا ہے کہ انتقام کی جگہ صبر اور غصے کی جگہ نرمی کو ترجیح دینی چاہیے۔ یہی وہ صفات ہیں جن کی وجہ سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لِكُلِّ نَبِيٍّ رَفِيْقٌ وَ رَفِيْقِيْ يَعْنِي فِي الْجَنَّةِ عُثْمَانُ۔

ہر نبی کا ایک رفیق ہوتا ہے اور جنت میں میرا رفیق عثمان رضی اللہ عنہ ہے۔ (سنن ترمذی، رقم الحدیث: ۴۵۴۰)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی حیا اور بردباری کے معاشرتی اثرات

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بردباری صرف ان کی ذاتی صفت نہ تھی، بلکہ اس نے اسلامی معاشرے میں وسعتِ قلب، برداشت، اور حسنِ خلق کی فضا قائم کی۔ ان کے دور میں مختلف علاقوں میں فتنے ابھرے، مگر انہوں نے ہر وقت امت کو جوڑے رکھا، جنگ سے بچایا، اور نرمی سے اصلاح کی کوشش کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بردباری اور حلم نے نہ صرف ان کی ذات کو بلند کیا بلکہ پوری اسلامی معاشرت کو نرمی، اتحاد اور صبر و ضبط کی طرف مائل کیا۔ ان کا طرزِ خلافت، طرزِ حکومت اور طرزِ شہادت ہمیں سکھاتا ہے کہ اصل قوت انتقام میں نہیں بلکہ حلم، معافی اور بردباری میں ہے۔ اگر آج کا معاشرہ ان اوصاف کو اپنا لے، تو بے راہ روی، بے حیائی، نفرت اور انتشار جیسے مسائل کا خاتمہ ممکن ہو سکتا ہے۔

حضرت عثمان ؓ کی حیا اور حلم نے مدینہ اور اسلامی دنیا میں ایک ایسا ماحول قائم کیا جس میں فواحش و منکرات کم ہو گئے، لوگ ایک دوسرے کے ادب و احترام کا خیال رکھنے لگے اور گفتگو، معاملات، اور عوامی رویے شائستہ ہو گئے۔ حضرت عثمان ؓ کی بردباری نے اسلامی قیادت کو یہ نظریہ دیا کہ اقتدار کا مقصد غلبہ نہیں، خدمت ہے، مخالفت پر بدلہ لینا نہیں بلکہ اصلاح کرنی ہے اور عوامی مسائل کا حل غصہ نہیں بلکہ صبر سے ہوتا ہے۔

آج کی دنیا میں جہاں قیادت غصے اور انتقام کی روش پر ہے، حضرت عثمان ؓ کی بردباری ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ قیادت کا اصل حسن؛ حلم و شفقت ہے۔ حضرت عثمان ؓ نے دینی تعلیمات کو نرمی، اخلاق اور سادہ اسلوب سے عام کیا۔ ان کا لہجہ کبھی سخت نہ ہوتا، وہ خطبات میں نرم الفاظ استعمال کرتے اور لوگوں کو محبت سے نصیحت کرتے۔ آپ ؓ یہی نرمی معاشرے میں دعوتِ دین کی قبولیت کا سبب بنی۔

حضرت عثمان بن عفان ؓ کی سیرت ہمارے موجودہ معاشرتی بحرانوں کے حل کی ایک روشن مثال ہے۔ آج کا معاشرہ فحاشی و عریانی، غصہ، سختی اور انتقام پر مبنی رویوں میں گھرا ہوا ہے۔ قیادت میں حلم اور بردباری کا فقدان ہے جبکہ نوجوانوں میں حیا ناپید ہو چکی ہے۔ اگر ان مسائل کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کا حل حضرت عثمان ؓ کی سیرت میں موجود ہے۔ ان کی زندگی اسلامی اخلاقیات کا عملی نمونہ تھی۔ آپ ؓ ایسی حیا کے حامل تھے کہ نبی کریم ﷺ اور فرشتے بھی ان سے حیا کرتے، اور ایسی بردباری رکھتے کہ دشمنوں کے دل بھی نرم ہو جاتے۔ ان کی یہی دو نمایاں صفات، یعنی حیا اور حلم، وہ بنیادیں ہیں جو فرد کو بہتر انسان بناتی ہیں، معاشرے کو صالح بناتی ہیں اور امت کو جوڑے رکھتی ہیں۔

حضرت عثمان ؓ نے ایک ایسا معاشرتی ماڈل قائم کیا جو قیامت تک کے لیے قابلِ عمل ہے۔ ان کی صفات نے دلوں کو جوڑا، معاشرتی فساد کو روکا اور امت میں اخلاق، محبت اور برداشت کا بیج بویا۔ اگر آج بھی ہم ان صفات کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اپنا لیں تو ہمارا معاشرہ امن، محبت اور اخلاقی بلندی کا نمونہ بن سکتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ حضرت عثمان ؓ کی سیرت سے سبق لیتے ہوئے اپنی نگاہوں کی حفاظت کریں، زبان و بیان میں حیا پیدا کریں، سختی کی جگہ نرمی اور غصے کی جگہ صبر و تحمل کو اپنائیں۔ یہی وہ طریقہ ہے جو معاشرتی اصلاح کا حقیقی ذریعہ ہے اور جس سے امتِ مسلمہ ایک بار پھر اخلاقی عروج حاصل کر سکتی ہے۔

شہادتِ امام حسین علیہ السلام کی انفرادیت اور معنویت

ڈاکٹر حافظ ظہیر احمد الاسنادی
سینئر ریسرچ سکالر فرید ملت ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربانی دینا نہایت اعلیٰ و ارفع اور مقرب ترین عمل ہے۔ یہ عمل جس قدر پُرخلوص ہو گا خالقِ کائنات کی نظر میں اُسی قدر مقبولیت کا سبب بنے گا۔ اَہلِ حق روزِ اوّل سے ہی رب کی رضا کے لیے قربانیاں دیتے چلے آئے ہیں۔ کسی نے اللہ کی راہ میں اپنے وقت کو قربان کیا۔۔۔ تو کسی نے اُس کی رضا کے لئے اپنا سارا مال و اسباب نثار کر دیا۔۔۔ کسی نے رب کی خوشنودی کے لیے اپنے گھر بار، اَعزاء و اقارب اور وطن کی قربانی دیتے ہوئے ہجرت کی۔۔۔ تو کسی نے کلمۂ حق کہنے کی پاداش میں کوڑے کھائے اور طعن و تشنیع کے تیر برداشت کیے۔۔۔ کسی نے حق کی خاطر اپنے ہی اعزاء اور خونی قرابت داروں سے قطع تعلقی کی قربانی دی۔۔۔ اور کسی پر اُن کے آقاؤں نے وحشت و بربریت کی اِنتہا کر دی۔ الغرض ہر حق پرست کو اس راہ میں طرح طرح کی مشکلات، مصائب اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا اور قربانیوں کی ادائیگی سے ہر رکاوٹ کو ٹھکراتے ہوئے آگے بڑھنے پر ہی انہیں کامیابی، کامرانی، سرفرازی اور سربلندی سے نوازا گیا۔

یوں تو راہِ حق میں پیش کی گئی ہر قربانی ہی قابلِ ستائش ہے، مگر سب سے افضل اور معتبر قربانی خالصتاً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اس کی راہ میں لڑتے ہوئے جان قربان کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان قربان کرنے کو یوں بقاے دوام بخشا گیا کہ اس کے عوض شہادت کا سرمدی منصب رکھ دیا گیا۔

قرآن مجید میں فلسفۂ شہادت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ملنے والی موت، موت نہیں بلکہ حیاتِ ابدی ہے اور یہ اللہ رب العزت کا بیش بہا انعام ہے۔

لاریب شہید کو موت نہیں، وہ مر کر زندہ رہتا ہے
کسی انساں کا یہ قول نہیں، رب میرا خود یہ کہتا ہے

تاریخِ عالم گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان ہونے والی پہلی جان سے لے کر آج کے دن تک لاکھوں، کروڑوں افراد نے رب رحیم کی رضا کو پایا ہے۔ ان خوش بخت اور سعید افراد میں انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے اصحاب بھی ہیں، صدیقین بھی ہیں، صالحین بھی ہیں اور علماء و فضلا بھی ہیں۔ ہر ایک کی قربانی دائمی ہے اور ہر شہید نے اپنے عظیم مقصد کے حصول کے لیے جان کا نذرانہ پیش کر کے اپنے فریضہ کی تکمیل کا حق ادا کر کے اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے مگر اپنی افادیت اور آفاقی اثرات کے حوالے سے شہادتِ امام حسین اور شہداء معرکۂ کرب و بلا کو ایک منفرد و ممتاز مقام حاصل ہے۔ سبطِ رسول ﷺ جگر گوشۂ علی و بتول حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے بہتّر (72) رُفقاء کے ہم راہ جس تسلیم و رضا کے انداز سے جامِ شہادت نوش فرمایا ہے، وہ انہیں مقامِ ابدیت پر فائز کر گیا ہے۔ علامہ اقبالؔ اس جاں نثاری کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

تقریباً چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود بھی شہادتِ امام حسین علیہ السلام کا ذکر زندہ و جاوید ہے۔ اس کی شہرت روز افزوں اور اس کا ذکر وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ حسینیت حق کا استعارہ اور یزیدیت باطل اور فتنہ و شر کا عنوان بن گئی ہے۔ شہادتِ امام حسین علیہ السلام کی اس قدر شہرت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ شہادتِ امام حسین علیہ السلام دراصل سیرتِ محمدی ﷺ کا ہی تکملہ اور تتمہ ہے۔۔۔ یہ حضور اکرم ﷺ کی سوانحِ حیات کے گوشوں میں سے ہی ایک گوشہ ہے۔۔۔ اور اِستقامتِ حسین علیہ السلام آپ ﷺ کے فضائل و کمالات میں سے ایک کمال ہے۔ اس شہادت کا وجود سیرتِ مصطفیٰ ﷺ سے الگ نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ رفعت و عظمت کا جو رنگ ہمیں سیرت النبی ﷺ میں نظر آتا ہے، شرف و قبولیت کی وہی جھلک شہادتِ امام حسین ﷺ میں بھی نظر آتی ہے۔

اسی لیے انسانی تاریخ کے اوراق جب بھی صداقت، حق پرستی، حق گوئی اور بے مثال بہادری کے لازوال کردار تلاش کرتے ہیں تو کربلا کا معرکہ اپنی تمام تر آب و تاب کے ساتھ سرِ فہرست نظر آتا ہے۔ شہادت امام حسین علیہ السلام محض ایک تاریخی واقعہ نہیں بلکہ تاریخِ اسلام کا ایک ایسا سنگِ میل ہے جو

ضمیر انسانی کی بیداری، حق و باطل کے معرکہ میں لازوال قربانی اور آئندہ نسلوں کے لیے حق گوئی اور عزیمت واستقامت کا ناقابل فراموش درس ہے۔ یہ واقعہ رہتی دنیا تک ایک پکار ہے کہ کبھی ظلم کے سامنے سر نہ جھکانا، چاہے جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

شہادتِ امام حسین علیہ السلام کا پسِ منظر

یزید لعین نے جب اسلام کے مقدس اصولوں کو پامال کرتے ہوئے اپنی شخصی آمریت کو دین کا لبادہ پہنانا چاہا، تب ضمیرِ انسانیت کے سب سے روشن مینار، جادۂ حق کے مسافر امام حسین علیہ السلام نے اس کے خلاف علمِ حق بلند کیا اور فرمایا:

يَزِيدُ رَجُلٌ فَاسِقٌ، شَارِبٌ لِلْخُمُورِ، قَاتِلٌ لِلنَّفْسِ الْمُحْتَرَمَةِ، وَمِثْلِي لَا يُبَايِعُ مِثْلَهُ۔

”یزید ایک فاسق، عادی شرابی اور قابل احترام (بے گناہ) جانوں کو قتل کرنے والا ہے، اور میرے جیسا شخص اس جیسے کی بیعت نہیں کر سکتا۔“

یہ ایک فرد کا انکار نہ تھا، بلکہ باطل اور جبر واستبداد کے نظام کے خلاف صدائے حق اور بغاوت تھی۔ امام حسین علیہ السلام نے کربلا میں اپنی اور اپنے خانوادہ کی قربانی دے کر ثابت کر دیا کہ دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بچانے کے لیے جان کی قربانی دینا عین فریضۂ ایمان ہے۔ انہوں نے اس بات کا برملا اعلان کیا کہ وہ یزید پلید کی بیعت کو اس لیے رد کرتے ہیں کیونکہ وہ ایک ظالم، جابر اور باطل حکمران ہے۔ امام حسین علیہ السلام کا باطل نظام کے خلاف قیام دراصل ایک زندہ ضمیر کی آواز ہے، جو ہر انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ ظلم و جبر کے خلاف قیام کرے، چاہے اس کا نتیجہ کتنی ہی بڑی قربانی کی صورت میں کیوں نہ ہو۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ الخ۔ (النساء، ۴: ۱۳۵)

”اے ایمان والو! تم انصاف پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے والے (محض) اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہو جاؤ خواہ (گواہی) خود تمہارے اپنے یا (تمہارے) والدین یا (تمہارے) رشتہ داروں کے ہی خلاف ہو۔“

یعنی ظالم کوئی بھی ہو اس کے خلاف مظلوم کی مدد کرو۔ حدیث نبوی میں افضل جہاد کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ۔

(سنن أبي داود: ۴۳۴۴)، (سنن الترمذي: ۲۱۷۴، وحسّنه.)

’’سب سے افضل جہاد جابر و ظالم حکمران کے سامنے حق بات کہنا ہے۔‘‘

امام حسین علیہ السلام کا قیام کسی شخصی اختلاف یا اقتدار کی کشمکش کے لیے نہیں تھا، بلکہ یہ ایک بگڑتے ہوئے دینی، اخلاقی اور سیاسی نظام کے خلاف ضمیرِ انسانی کی بیداری تھی۔ امام حسین علیہ السلام نے اچھی طرح سے یہ جانتے ہوئے بھی کہ جان چلی جائے گی، گھر لٹ جائے گا، خاندان کے چراغ بجھ جائیں گے مگر حق گوئی سے منہ نہ موڑا۔ امام حسین علیہ السلام کی یہ جرأت ہمیں دعوت دیتی ہے کہ ہم کسی بھی قیمت پر سچ کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ امام عالی مقام کا انکار یزید کے خلاف فقط ایک سیاسی مؤقف نہ تھا بلکہ یہ ضمیر کی حقیقی صدا تھی۔ آپ علیہ السلام نے کسی مصلحت یا وقتی فائدے کی خاطر حق سے دستبردار ہونا گوارا نہ کیا۔ آپ کی شہادت ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ ضمیر کی آواز سننا اور اسے تھامے رکھنا ایک کامل مؤمن کا شیوہ ہے، خواہ پوری دنیا مخالفت میں کیوں نہ ہو۔

شاہ است حسین، پادشاہ ہست حسین
دین است حسین، دیں پناہ است حسین
سر داد نہ داد دست، در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

’’شاہ بھی حسین ہیں، بادشاہ بھی حسین ہیں، دین بھی حسین ہیں دین کی پناہ بھی حسین ہیں۔ آپ نے اپنا سر کٹوا دیا لیکن یزید کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دیا، سچ یہ ہے کہ کلمۂ طیبہ کی بنیاد بھی حسین ہیں۔‘‘

شہادتِ امام حسین علیہ السلام (احادیث مبارکہ کی روشنی میں)

آج ایک ایسا طبقہ بھی وجود میں آچکا ہے کہ جس کے افراد نہایت درجہ کور چشم، شقی القلب اور حُبِ اہلِ بیتِ اَطہار سے عاری ہیں۔ یہ لوگ تاریخِ اسلام کے اس دِل دوز اور جگر خراش سانحے کو محض قصے کہانیاں کہتے، تاریخ کے ان واقعات کو جھٹلاتے، انہیں بیان کرنے والوں کی تکذیب و تضحیک کرتے حتیٰ کہ استہزاء کر کے بغض و عنادِ اہلِ بیت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ محض اُن کا بُغض و عناد نہیں بلکہ ان کا شدید ترین خبثِ باطن ہے۔ یزید سے محبت اور آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عداوت انہیں دولتِ اِسلام اور متاعِ ایمان سے محروم کر کے عذابِ اَلیم، عذابِ عظیم اور عذابِ مُہِیْن سے دو چار کر کے جہنم کا ایندھن بنا دے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی تمام تر کاوشوں کے باوجود واقعۂ کربلا کی اہمیت کم نہیں ہو سکتی۔

جو ایسا کرنے کی جسارت کرتا ہے، وہ شجرِ اسلام کی جڑوں کو کاٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ حضور ﷺ کے فرمودات، اُمہات المؤمنین کے اِرشادات اور صحابہ کرام کے بیانات اس واقعہ کی تصدیق کرتے ہیں۔ نیز ان احادیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کربلا کا واقعہ محض ایک حادثہ نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق سیرتِ نبوی ﷺ کی پیشین گوئیوں اور اہلِ بیت کی عظمت سے ہے۔ اس سلسلہ میں چند احادیث مبارکہ اور روایات ملاحظہ ہوں:

۱۔ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آقا علیہ السلام کے چشمان مقدس سے آنسو رواں تھے۔ میں نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! آج کیا بات ہے، چشمان مقدس سے آنسو رواں ہیں؟ فرمایا کہ مجھے ابھی ابھی جبرئیل خبر دے گیا ہے:

ان امتك ستقتل هذا بأرض يقال لها كربلاء۔

آپ کی امت آپ (ﷺ) کے اس بیٹے حسین کو اس سرزمین پر قتل کر دے گی جس کو کربلا کہا جاتا ہے۔

(المعجم الکبیر، ۳: ۱۰۹، رقم: ۲۸۱۹)

۲۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

أخبرني جبرئيل ان ابني الحسين يقتل بأرض العراق فقلت لجبرئيل ارني تربة الارض التي يقتل فيها، فجاء فهذه تربتها۔

"مجھے جبرئیل امین نے (عالم بیداری میں) بتایا کہ میرا یہ بیٹا حسین عراق کی سرزمین میں قتل کر دیا جائے گا۔ میں نے کہا: جبرئیل مجھے اس زمین کی مٹی لا کر دکھا دو جہاں حسین کو قتل کر دیا جائے گا پس جبرئیل گئے اور مٹی لا کر دکھا دی کہ یہ اس کے مقتل کی مٹی ہے۔" (کنز العمال، ۱۲: ۱۲۶، ح: ۳۴۳۱۳)

جبرئیل نے کربلا کی مٹی لا کر حضور نبی کریم ﷺ کو دی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اے ام سلمہ رضی اللہ عنہا جب یہ مٹی خون میں بدل جائے تو جان لینا کہ میرا یہ بیٹا قتل ہو گیا ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس مٹی کو بوتل میں رکھ دیا تھا اور وہ ہر روز اس کو دیکھتیں اور فرماتیں: اے مٹی! جس دن تو خون ہو جائے گی، وہ دن بڑا بھاری دن ہو گا۔ (المعجم الکبیر، ۳: ۱۰۸)

۳۔ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حسین بن علی کو ساٹھ ہجری کے اختتام پر شہید کر دیا جائے گا۔

آپ ﷺ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے نہ صرف مقتل کی نشاندہی کر دی کہ یہ عراق کا میدان کربلا ہو گا بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ یہ عظیم سانحہ کب رونما ہو گا۔

۴۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اکثر دعا فرمایا کرتے:

اللھم انی اعوذبك من رأس الستین و امارۃ الصبیان

اے اللہ میں ساٹھ ہجری کی ابتدا اور (گنوار) لڑکوں کی حکومت سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

60 ہجری کی ابتدا میں ہی ملوکیت کی طرف قدم بڑھایا جا چکا تھا اور خلفائے راشدین کے نقش قدم سے انحراف کی راہ نکالی جا رہی تھی۔

۵۔ حضرت یحییٰ حضرمی کہتے ہیں کہ میں سفر صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا۔ جب ہم نینوا کے قریب پہنچے تو آپ نے فرمایا: اے ابو عبداللہ! فرات کے کنارے رکنا۔ میں نے عرض کیا: کیوں؟ فرمایا کہ تاجدار کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے جبرئیل نے خبر دی ہے:

ان الحسین یقتل بشط الفرات و ارانی قبضة من تربته

حسین رضی اللہ عنہ فرات کے کنارے قتل ہو گا اور مجھے وہاں کی مٹی بھی دکھائی۔

شہادت امام حسین کی انفرادیت اور عظمت کا یہ پہلو بطور خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس اس عظیم واقعہ کے تذکرے عہدِ رسالت میں ہی ہونے لگے تھے اور اس سانحہ کی خبر دیتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چشمانِ مقدسہ پر نم تھیں۔ کسی واقعہ کا اپنے ہونے سے قبل مقبولیت حاصل کر لینا، اس کے غیر معمولی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

محبتِ اہلِ بیت اطہار علیہم السلام جزوِ ایمان ہے

مودّت و محبتِ اہلِ بیتِ اَطہار علیہم السلام ہمارے ایمان کا حصہ ہے اور عقائد کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے جو نصوصِ قرآن، احادیثِ صحیحہ اور سنتِ نبوی سے ثابت ہے۔ یہ عقیدہ سنتِ نبوی، صحابہ کرام، تابعین، اَتباع التابعین، ائمہ اَربعہ، فقہاے کرام، محدثین اور ائمہ اُصولِ دین سے تسلسل کے ساتھ نقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں اَہلِ بیتِ اَطہار علیہم السلام کے ساتھ محبت و مودّت کے اس عقیدۂ صحیحہ کو ذاتی اور سیاسی تعصبات و مفادات کی بھینٹ چڑھانے کی مذموم سعی کی جا رہی ہے۔ یہ سب کچھ سراسر مقامی، علاقائی اور سیاسی معاملات ہیں جن پر سیاسی تجزیے تو بنتے ہیں مگر اُن کا عقائد کے ساتھ قطعاً کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے تھا، مگر بد قسمتی سے ان سیاسی عوامل کے اثرات براہِ راست عقائد پر مرتب ہوئے اور ان کی وجہ سے لوگوں کے عقائد اور نظریات متاثر ہونے لگے۔

تاریخی طور پر خارجیت کا تسلسل زمانۂ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ ان کا فکری ارتقاء اگرچہ سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ہو چکا تھا مگر ان کا عملی ظہور سیدنا علی علیہ السلام کے زمانۂ خلافت میں ہوا۔ حُبِّ

اَہلِ بیتِ اَطہار علیہم السلام کو شیعیت قرار دینا بھی اِسی خارجی ذہن کی پیداوار اور زاویۂ نگاہ ہے۔ مسلکی عداوت، علاقائی سیاست اور بین الاقوامی ایجنڈا؛ ان سب عوامل نے مل کر لاشعوری طور پر کئی لوگوں کے ذہن بدل دیے اور حالت یہ ہو گئی ہے کہ اب اُنہیں یہ احساس ہی نہیں ہے کہ ہم اُسی پیڑ کی جڑیں کاٹ رہے ہیں جس کے سائے تلے خود بیٹھے ہیں۔ اس مسلکی عداوت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب اَہلِ بیت کا نام لینے کو شیعیت سمجھا جاتا ہے۔ امام حسن، امام حسین یا اَہلِ بیتِ اَطہار علیہم السلام کا اگر ادب سے نام لے لیں تو فوراً فتویٰ داغ دیا جاتا ہے کہ یہ شیعیت بول رہی ہے۔ اِسی طرح یزید پلید اور اُس کے ماتحت طبقہ کی بے ایمانی اور خبثِ باطن پر بات کی جائے اور اُس کے کفریہ اعمال کی نشاندہی کی جائے تو بھی ریڈ الرٹ ہو جاتا ہے کہ اس طرح کہنے والے اَہلِ تشیع ہی ہو سکتے ہیں۔

اس بڑھتے ناسور اور مشکوک و مذموم سوچ نے اچھے بھلے صحیح العقیدہ لوگوں کے ذہن بھی گرد آلود کر دیے ہیں اور عامۃ الناس کو مخمصے اور تشکیک میں ڈال دیا ہے۔ ان خارجی اثرات کی پیدا کردہ فضا اور ماحول کے باعث ضروری ہے کہ اَہلِ بیتِ اَطہار علیہم السلام کے حوالے سے عامۃ المسلمین کے قلوب و اذہان پر پڑی گرد کو ہٹا کر اُن کے عقائد کو صاف اور اُجلا کیا جائے۔

ذہن نشین رہے کہ اَہلِ سنت کے اس عقیدہ کا شیعیت و رافضیت سے رتی برابر تعلق نہیں ہے بلکہ یہ اَہلِ سنت کی اپنی فکری تاریخ، نظریاتی رُجحان، اِعتقادی میراث اور ایمان کی اساس ہے۔ یہ خارجی ذہنیت ہی ہے جس نے امام عالی مقام کی ذاتِ اقدس اور اَہلِ بیتِ اَطہار علیہم السلام کے ساتھ محبت و مودّت کم کرنے کے لیے طرح طرح کے فکری، اعتقادی، تاریخی اور نظریاتی مغالطے پیدا کیے اور تشکیک پر مبنی ابحاث کی روایت ڈالی۔

عصرِ حاضر میں شہادتِ حسین علیہ السلام کی معنویت اور عملی تقاضے

آج جب کہ دنیا مختلف قسم کے ظلم، جبر، استبداد، کرپشن اور منافقت کا شکار ہے، کربلا کا پیغام اور امام حسین علیہ السلام کی شہادت کی معنویت پہلے سے کہیں زیادہ نمایاں ہو چکی ہے۔ یہ پیغام ضمیر کی آواز کی صورت میں ہمیں جھنجھوڑتا ہے کہ ہم اپنی زندگیوں میں حق گوئی، عدل اور حریت کو کیسے زندہ کریں۔ شہادتِ امام حسین علیہ السلام کی عصری معنویت یہی ہے کہ ہم دینِ اسلام کی بقاء کے تقاضوں کو سمجھیں کہ دین اسلام کی بقا کا راز کس امر میں پوشیدہ ہے۔ ہم ظاہری مفادات کے بجائے اصولوں کی پاسداری کریں۔ ہم وقتی کامیابیوں کے بجائے اس راستے پر چلیں کہ جس کے نتیجہ کے طور پر حقیقی کامیابی نصیب ہو۔ ہم دین کی عزت کی بحالی کے لیے درست وقت پر درست اقدام کریں اور اس اقدام کے مطابق ہر

طرح کی قربانی کا جذبہ اپنے اندر پیدا کریں۔

یاد رہے کہ معرکہ کربلا کسی ایک نسل، قوم یا مذہب کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ امام حسین علیہ السلام صرف مسلمانوں کے ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کے رہنما ہیں۔ آج بھی ہر مظلوم حسین کی طرف دیکھتا ہے، اور ہر ظالم و جابر یزید کا جانشین تصور کیا جاتا ہے۔ عصرِ حاضر میں ظلم کے خلاف جد وجہد کے ہر علمبردار کو چاہیے کہ وہ کربلا سے سبق لیتے ہوئے ظلم کے آگے سر نہ جھکائے، حق پر ڈٹا رہے، اور کسی کمزوری، مصلحت یا خوف کے تحت حق کو نہ چھوڑے۔ یہی حسینیت ہے۔ یہی ضمیر کی صدائے بازگشت ہے۔

بہ قول شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری آج شہادتِ حسین علیہ السلام ہمیں دعوت دیتی ہے کہ اپنے ضمیر کی تربیت کریں، حق کو پہچانیں اور باطل سے نفرت کریں۔ اپنے اندر حق گوئی کی جرأت پیدا کریں اور سچ کو کسی قیمت پر نہ چھوڑیں۔ ظلم کے خلاف قیام کریں، خواہ وہ ظلم سماجی ہو، معاشی ہو یا فکری ہو۔ اصلاحِ معاشرہ میں اپنا کردار ادا کریں، ہر شعبہ زندگی میں دین کی روح کے مطابق کردار ادا کریں۔ محبتِ اہلِ بیت کو عملی جامہ پہناتے ہوئے امام حسین علیہ السلام سے محبت صرف سوگ یا عقیدت کے اظہار تک محدود نہ رہے، بلکہ ان کے مشن کو اپنی عملی زندگی میں نافذ کریں۔

آج کے مسلم معاشرے کے لیے امام حسین علیہ السلام کا باطل نظام کے خلاف قیام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہمیں کبھی ظلم کے سامنے سر نہیں جھکانا چاہیے۔ نہ صرف ہمیں اپنے ذاتی معاملات میں بلکہ ہر سطح پر حق گوئی کا دامن تھامے رکھنا چاہیے۔ امام حسین علیہ السلام کی قربانی نے یہ ثابت کیا کہ حق کی آواز کبھی کمزور نہیں ہوتی، چاہے دنیا کا کوئی بھی جابر اور طاقت ور حکمران اس کے مقابل کھڑا ہو۔

امام حسین علیہ السلام کی شہادت نے ہمیں یہ سکھایا کہ انسان کی سب سے بڑی طاقت اس کا ضمیر ہے اور ضمیر کی آواز پر عمل کرنا ہی انسانیت کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ امام عالی مقام نے کربلا میں جو قربانی دی، وہ دراصل ہر انسان کو سچائی، استقامت اور حق گوئی کے لیے ایک روشن مثال فراہم کرتی ہے۔

آیئے! ہم امام حسین علیہ السلام کی سیرت کو اپنے عمل میں ڈھالیں اور اس کی روشنی میں اپنے جملہ معاملات کو درست کریں تاکہ ہم بھی اپنی زندگیوں میں حق کے راستے پر ثابت قدم رہ کر اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکیں اور بارگاہِ الٰہی میں بھی سرخرو ہو سکیں۔ اللہ رب العزت ہمیں امام حسین علیہ السلام کی سیرت پر عمل کرنے کی توفیق اور ہر دور میں دینِ اسلام کی بقا کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

سانحۂ ماڈل ٹاؤن کے 11 برس

نعیم الدین چوہدری ایڈووکیٹ

ایڈووکیٹ ہائی کورٹ، ترجمان سانحہ ماڈل ٹاؤن لیگل ٹیم

شہدائے سانحہ ماڈل ٹاؤن لاہور کی 11 ویں برسی پر جہاں ہمارے دل غم سے نڈھال ہیں وہاں ہمارے دلوں کو اطمینان بھی میسر ہے کہ شہدائے سانحہ ماڈل ٹاؤن کے ورثاء اور شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی حصولِ انصاف کی جدوجہد 11 سال کے بعد بھی پوری طاقت، عزم، استقامت کے ساتھ جاری ہے۔ حصولِ انصاف کی اس جدوجہد میں شہدائے سانحہ ماڈل ٹاؤن کے ورثاء کا شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری پر غیر متزلزل یقین اور اعتماد کا اظہار قابلِ فخر اور قابلِ تقلید ہے۔ ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے گزشتہ 11 سالوں کا ہر دن حصولِ انصاف کی جدوجہد میں گزارا۔ الحمدللہ اس جدوجہد میں نہ قیادت کے عزم میں کوئی شکن آئی اور نہ ہی شہدائے سانحہ ماڈل ٹاؤن کے ورثاء کے عزم و ہمت اور حوصلے کو وقت کی نمرودی، فرعونی اور قارونی قوت متزلزل کر سکی۔

17 جون 2014ء پاکستان کی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے جس دن نواز، شہباز حکومت نے طے شدہ منصوبہ بندی کے تحت شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی رہائش گاہ اور ادارہ منہاج القرآن کے مرکزی سیکرٹریٹ پر جس طرح ریاستی دہشتگردی کی، پاکستان کی سیاسی و سماجی تاریخ میں اسکی مثال نہیں ملتی۔ اس سانحہ میں پاکستان عوامی تحریک اور ادارہ منہاج القرآن کے معصوم، نہتے اور بے گناہ کارکنوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ دہشتگردی پر مبنی خونی مناظر پوری دنیا نے میڈیا چینلز کے ذریعے براہِ

راست دیکھے۔ اس المناک واقعہ میں 14 افراد شہید ہوئے جن میں دو خواتین بھی شامل تھیں۔ سو سے زائد افراد کو سیدھی گولیاں ماری گئیں اور شدید زخمی کیا گیا۔

سانحہ ماڈل ٹاؤن ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا اس لیے سانحہ کے فوری بعد قتل و غارت گری میں ملوث افسران واہلکاران کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی گئی بلکہ سانحہ میں حصہ لینے والے تمام افسران واہلکاران کو پرکشش عہدوں سے نوازا گیا، انہیں آؤٹ آف ٹرن ترقیاں دینے کے ساتھ ان کی پسند کی تقرریاں بھی کی گئیں۔

اس سانحہ کا پسِ منظر یہ ہے کہ 2010ء میں شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے پاکستان اور دنیا کے دیگر علاقوں میں ہونے والی دہشت گردی کے خلاف ایک عالمی اہمیت کا فتویٰ جاری کیا جو کہ 600 صفحات پر مشتمل ہے اور دہشت گردی اور فتنہ خوارج کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس فتویٰ کو پوری دنیا میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ پاکستان اور دنیا بھر میں دہشت گرد مشتعل ہو کر بوکھلا اُٹھے اور شیخ الاسلام کے جانی دشمن بن گئے۔ پاکستان اور دنیا بھر کے دہشت گروں نے شیخ الاسلام کو جان سے مار دینے کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں جس پر پاکستان کی مختلف ایجنسیوں نے شیخ الاسلام کو ان دہشت گردوں کے مذموم عزائم کے بارے میں تحریری طور پر آگاہ بھی کیا۔

چنانچہ عدالت عالیہ لاہور کے حکم سے پولیس نے خود اس وقت کے SP ماڈل ٹاؤن ایاز سلیم کی موجودگی و نگرانی میں منہاج القرآن سیکرٹریٹ اور گردونواح میں بیریئرز لگوائے۔ رٹ پٹیشن 22367/2010 کی سماعت کے دوران عدالتِ عالیہ کے حکم سے مورخہ 20/01/2011 کو ایاز سلیم سابق SP ماڈل ٹاؤن لاہور عدالتِ عالیہ میں حاضر ہوئے اور اپنا بیان قلمبند کروایا جس میں عدالت عالیہ کو تحریری یقین دہانی کروائی کہ انہوں نے ادارہ منہاج القرآن اور گردونواح کے مکینوں کی سیکیورٹی کے لئے 16 پولیس اہلکاران کو 24 گھنٹے متعین کر دیا ہے اور متعلقہ سڑکوں پر جرسی بیریئرز (Jersey Barriers) رکھوا دیے ہیں۔

☆ 2010ء سے 2014ء یعنی چار سال تک یہ بیریئرز لگے رہے۔ اس دوران میں شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے ملک میں بڑھتی ہوئی مہنگائی، بے روزگاری، کرپشن، عوام کے حقوق کی بازیابی اور قانون وآئین کی بالادستی کے لیے پاکستان آکر حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کیا تو حکومت بوکھلا اُٹھی اور اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتر آئی اور اس تحریک کو کچلنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔

☆ چنانچہ اس منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مورخہ 16 جون 2014ء کو رانا ثناءاللہ وزیر قانون کی زیر صدارت اجلاس ہوا۔ فیصلہ کیا گیا کہ ادارہ منہاج القرآن اور شیخ الاسلام کی

رہائش گاہ کے ارد گرد لگے بیریئرز کو ہٹانے کے بہانے دھاوا بولا جائے گا اور جو بھی شخص اس میں رکاوٹ بنے گا، اُسے ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ اگلے دن اس منصوبے پر من و عن عمل کیا گیا اور اپنے مکروہ و مذموم مقاصد کے حصول کے لیے سیدھی گولیاں چلائی گئیں جس کے نتیجہ میں 14 افراد جان کی بازی ہار گئے۔

☆ سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین کی وقوعہ کے بعد FIR درج نہ کی گئی تو سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین نے FIR کے اندراج کے لیے جسٹس آف پیس کی عدالت سے رجوع کیا۔ جسٹس آف پیس نے مورخہ 16 اگست 2014ء کو ایف، آئی، آر کے اندراج کا حکم دیا لیکن اس کے باوجود پولیس نے سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین کی ایف، آئی، آر کا اندراج نہ کیا۔ ملزمان نے جسٹس آف پیس کے حکم کے خلاف معزز عدالت عالیہ لاہور سے رجوع کیا۔ معزز عدالت عالیہ لاہور نے ملزمان کی پٹیشن (مورخہ 26/08/2014) کو خارج کر دی۔ جس پر بالآخر پولیس نے بہ دل نخواستہ مقدمہ نمبر (696/14) تھانہ فیصل ٹاؤن لاہور مورخہ 28/08/2014 کو درج کر دیا۔ مگر پاکستان عوامی تحریک کے کارکنان پر 50 سے زائد مختلف تھانوں میں ایف، آئی، آر درج کر دیں تاکہ سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین، گواہان، مضروبان شامل تفتیش نہ ہو سکیں۔

مورخہ 17 جون 2014ء کو ہی پولیس کی مدعیت میں جھوٹی FIR No.510/14 درج کر کے زخمی کارکنان اور مقتولین کے لواحقین کو گرفتار کر کے دنیا کی تاریخ میں ظلم و ناانصافی کی نئی مثال قائم کر دی۔ حکومت کی اس بدنیتی اور ظالمانہ اقدامات پر اگست 2014ء میں اسلام آباد تک لانگ مارچ کیا گیا اور پھر اکتوبر 2014ء تک 72 دن کا ایک طویل دھرنا دیا گیا۔ اس کے نتیجہ میں بالآخر پاکستان عوامی تحریک ملزمان کے خلاف اپنی FIR کٹوانے میں کامیاب ہوئی۔

☆ بعد ازاں اس سانحہ پر مقدمہ نمبر 510/14 میں JIT تشکیل پائی جس میں دو ایجنسیوں (MI,ISI) کی نمائندگی بھی شامل تھی۔ جس میں دونوں ایجنسیوں (MI,ISI) نے کہا کہ اس FIR کو ختم ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے باوجود اس مقدمہ کا چالان انسداد دہشت گردی کورٹ لاہور میں پیش کیا گیا اور جنوری 2015ء سے اب تک PAT کے بے گناہ افراد اس مقدمہ میں پیش ہو رہے ہیں، جس میں 600 سے زائد تاریخیں ہو چکی ہیں۔ MI,ISI کے اس اختلافی نوٹ کی موجودگی میں مقدمہ نمبر 510/14 کا چالان انسداد دہشت گردی عدالت میں پیش نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اس کے باوجود انسداد دہشت گردی عدالت لاہور میں چالان پیش کیا گیا۔

مقدمہ نمبر 510/14 (پولیس مدعی) میں JIT کے مطابق پولیس نے ریکارڈ میں تبدیلی اور اسلحہ کی درست تفصیلات نہ دی تھیں۔ اس JIT میں دو ممبران جن کا تعلق MI اور ISI کے ساتھ تھا، ان کے علاوہ تمام ممبران پولیس افسران تھے۔ JIT نے اس بات کو تسلیم کیا کہ جب پولیس سے آرمز اینڈ ایمونیشن کی تفصیلات مانگی گئی کہ کتنا اسلحہ ایشو کیا گیا۔۔۔؟ کتنا استعمال کیا گیا۔۔۔؟ اور کتنا واپس جمع کروایا گیا۔۔۔؟ تو پولیس نے فہرستیں دینے سے انکار کر دیا۔ جبکہ مذکورہ بالا دو ممبران (MI,ISI) نے یہاں تک کہہ دیا کہ مقدمہ نمبر 510/14 قابل منسوخی ہے۔

عبدالروف SI انچارج ایلیٹ فورس کو JIT نے دوران تفتیش متعدد بار طلب کیا۔ دوران تفتیش اس نے تسلیم کیا کہ ایلیٹ فورس کی جانب سے SMG469 کے اور 59 راونڈ G3 رائفل کے فائر کیے گئے۔ بعد میں اگلی پیشی پر اس نے بتایا کہ ایس پی عبدالرحیم شیرازی نے اسے کہا تھا کہ ریکارڈ تبدیل کر دیا جائے۔

JIT کی جانب سے CCPO لاہور کو لیٹر نمبری 449 PSSB/مورخہ 30/06/14 کو بھیجا گیا جس میں تمام افسران اور جوانوں کی پوسٹنگ اور ٹیلی فون نمبرز، ایشو کردہ ہتھیار اور ان کے سیریل نمبرز اور استعمال ہونے والے ایمونیشن کی تفصیل مطابق روزنامچہ ہائے، ٹیر گیس گنز اور ان کا مصرف اور آپریشن کے دوران کتنے ٹیر گیس شیل استعمال ہوئے، دیگر سامان کوئی بھی جو اس اپریشن کے دوران کم یا ناکارہ ہوا، اس کی تفصیل JIT کو بہم پہنچائی جائے مگر اس کی مکمل تفصیل آج تک نہیں پہنچائی گئی۔

☆ بعد ازاں اس سانحہ پر حکومت نے ایک JIT تشکیل دی۔ اس JIT نے مقدمہ میں تفتیش، انتہائی متعصبانہ، حقائق کے برعکس اور یکطرفہ کی۔ جو میٹریل، Evidence مقدمہ کی تفتیش کو مکمل کرنے کے لئے Collect کرنی تھی، وہ نہ کی گئی۔

تمام ریکارڈ، گورنمنٹ کے اداروں اور ان بااثر ملزمان کے زیر قبضہ تھا جس تک سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین کی رسائی ہرگز ممکن نہیں تھی مگر وہ ریکارڈ جس سے مقدمہ نمبر 510/14 جھوٹ کا پلندہ ثابت ہوتا تھا اور مقدمہ نمبر 696/14 سچا ثابت ہوتا تھا، وہ جان بوجھ کر تفتیش کے ریکارڈ کا حصہ نہ بنایا گیا۔

اس JIT نے سرکاری ریکارڈ، میڈیا ریکارڈ، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا ریکارڈ، CDR اور ٹی وی چینلز کے متعلقہ لوگوں کو بھی شامل تفتیش نہ کیا۔

وہ تمام میٹریل اور شہادتیں جن کو تفتیش کا حصہ بنانا ضروری اور لازمی ہے، ان تک تاحال مستغیثِ

مقدمہ کی رسائی نہیں ہے۔ یہ JIT پوری طرف ناکام رہی کہ ساری شہادتوں کو مسل کا حصہ بنائے۔ درست تفتیش کرنا، درست ٹرائل کرانا ہر شہری کا Statutory Right ہے جو اس کو آئین اور قانون نے دیا ہے۔ یہ JIT کوئی بھی میٹریل شہادتیں صفحہ مسل پر نہ لائی ہے اور اس نے درست حقائق اور صحیح شہادتوں کو چھپایا ہے جو کہ ان کے Part پر بددیانتی ہے۔ اس JIT نے مذکورہ بالا سارا ریکارڈ جو مقدمہ کے درست فیصلہ کے لیے ضروری تھا، اُسے عدالت میں جمع نہیں کروایا۔

حتیٰ کہ اس JIT نے سانحہ ماڈل ٹاؤن کے کسی زخمی، چشم دید گواہ کا کوئی بیان ریکارڈ نہ کیا بلکہ جانبدار تفتیش کر کے سانحہ کے تمام مرکزی ملزمان سابق وزیر اعظم نواز شریف، موجودہ وزیر اعظم میاں شہباز شریف، سابق وزیر قانون پنجاب رانا ثناء اللہ و دیگران اور پولیس افسران جو بطور ملزمان ایف آئی آر میں نامزد تھے، بددیانتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس JIT نے ان ملزمان کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی بلکہ ان تمام ملزمان کو کلین چٹ دے دی گئی اور سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین کی دادرسی نہ کی گئی۔

☆ اس صورت حال میں سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین کے پاس استغاثہ دائر کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ لہذا عدالت میں چالان پیش ہونے کے فوری بعد انسداد دہشت گردی عدالت لاہور میں استغاثہ دائر کر دیا گیا۔ استغاثہ کیس میں 56 زخمی و چشم دید گواہان کے بیانات مکمل ہونے کے بعد مورخہ 7 فروری 2017ء کو انسداد دہشت گردی عدالت لاہور نے سانحہ ماڈل ٹاؤن کیس میں 124 ملزمان، کانسٹیبل سے لے کر آئی جی پنجاب تک، اس وقت کے DCO کیپٹن (ر) محمد عثمان، اس وقت کے TMO نشتر ٹاؤن علی عباس بخاری، اس وقت کے AC ماڈل ٹاؤن طارق منظور چانڈیو کو بطور ملزمان طلب کر لیا تھا لیکن 12 ملزمان جن میں میاں نواز شریف، میاں شہباز شریف، رانا ثناء اللہ، ڈاکٹر توقیر شاہ و دیگران جنہوں نے اس سانحہ کی منصوبہ بندی کی تھی، ان کو طلب نہ کیا تھا۔

☆ استغاثہ میں ٹرائل کورٹ از خود فوجداری مقدمہ کی سماعت کے دوران شفاف ٹرائل کے لیے بقیہ شہادت برآمدگی، فرانزنک اور ڈیجٹل وغیرہ کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی ہے۔ بلکہ صرف اور صرف غیر جانبدار JIT ہی شفاف ٹرائل کے لئے ان تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے۔ اس لئے 2018ء میں تنزیلہ امجد (مقتولہ سانحہ ماڈل ٹاؤن) کی بیٹی بسمہ امجد نے سانحہ ماڈل ٹاؤن کی غیر جانبدار تفتیش کے لیے سپریم کورٹ ہیومن رائٹس کیس نمبر 69031/18 میں نئی JIT کے لئے درخواست گزاری جس کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی سربراہی میں 5 رکنی لارجر بینچ نے مورخہ 5 دسمبر 2018ء کو سپریم کورٹ اسلام آباد میں سماعت کی اور شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے دلائل کی روشنی میں سانحہ ماڈل ٹاؤن کیس کی از سر نو تفتیش کے لئے نئی JIT بنانے کا فیصلہ ہوا۔

☆ مورخہ 3 جنوری 2019ء کو پنجاب حکومت نے اے ڈی خواجہ کی سربراہی میں نئی JIT کا نوٹیفکیشن جاری کر دیا۔ سپریم کورٹ کے فلور پر سانحہ ماڈل ٹاؤن کی تفتیش کے لئے تشکیل پانے والی نئی JIT نے مورخہ 14 جنوری 2019ء سے لے کر 20 مارچ 2019ء تک سانحہ ماڈل ٹاؤن کے تمام زخمی، چشم دید گواہان اور شہداء کے لواحقین کے بیانات ریکارڈ کر لئے تھے اور سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین کی طرف سے نئی JIT کے روبرو پہلی دفعہ تمام زبانی و دستاویزی ثبوت شہادتوں کی شکل میں پیش کر دیے گئے اور اس طرح اس نئی JIT نے سانحہ ماڈل ٹاؤن کے تمام ملزمان سے بھی تفتیش مکمل کر لی تھی۔

سربراہ JIT اے ڈی خواجہ نے لاہور ہائی کورٹ میں جواب داخل کروایا۔ اُس ریکارڈ کے مطابق نئی JIT نے 281 بیانات ریکارڈ کیے اور 80% تفتیش مکمل کر لی۔ نئی JIT نے سانحہ ماڈل ٹاؤن کے تمام ملزمان بشمول سابق وزیر اعظم میاں نواز شریف، موجودہ وزیر اعظم میاں شہباز شریف، سابق وزیر قانون پنجاب رانا ثناء اللہ، ڈاکٹر توقیر شاہ PSO ٹو وزیر اعلیٰ پنجاب، سابق آئی جی پنجاب مشتاق احمد سکھیرا سے مختلف پہلوؤں پر تفتیش مکمل کر لی تاکہ معلوم ہو سکے کہ یہ وقوعہ کیوں ہوا ہے۔۔۔؟ اس کے پیچھے کیا سازش کارفرما تھی۔۔۔؟ اس وقوعہ کے پیچھے کون کون سازشی عناصر موجود ہیں۔۔۔؟ اور یہ سازش کہاں سے چلی۔۔۔؟ اور کس طرح اس سازش پر عملدرآمد ہوا؟

☆ اس نئی JIT کے ذریعے حقائق سامنے آنے کے خوف کے سبب فوری طور پر کچھ قوتیں متحرک ہو گئیں اور سانحہ ماڈل ٹاؤن کے ملزمان (رضوان قادر ہاشمی SHO تھانہ فیصل ٹاؤن، مدعی مقدمہ 510/14) اور خرم رفیق ہیڈ کانسٹیبل کی درخواست پر لاہور ہائی کورٹ نے JIT کی تشکیل کا پنجاب حکومت کا نوٹیفکیشن 22 مارچ 2019ء کو معطل کر دیا اور JIT کو سانحہ ماڈل ٹاؤن کی مزید تفتیش کرنے سے روک دیا گیا۔

☆ JIT کے نوٹیفکیشن کی معطلی کے خلاف لاہور ہائی کورٹ کے عبوری حکم مورخہ 22 مارچ 2019ء کے خلاف سپریم کورٹ اسلام آباد میں رجوع کیا۔ مورخہ 13 فروری 2020ء کو سابق چیف جسٹس، جسٹس گلزار احمد کی سربراہی میں 3 رکنی بینچ نے سماعت کی، جس میں سپریم کورٹ نے 13 فروری 2020ء کو لاہور ہائی کورٹ کو ڈائریکشن دی کہ نیا بینچ تشکیل دے اور ترجیحاً تین ماہ کے اندر فیصلہ کیا جائے۔ لیکن سپریم کورٹ کی تین ماہ کی ڈائریکشن کے باوجود بھی لاہور ہائی کورٹ کے 7 رکنی لارجر بینچ نے فریقین کے دلائل جو عرصہ دراز سے مکمل ہو چکے ہیں، اس کے باوجود تاحال فیصلہ نہیں کیا۔

☆ یہ JIT جسے ہائی کورٹ نے معطل کر رکھا ہے، سارا میٹریل Collect کر کے 173 Crpc کی رپورٹ عدالت میں بجھوائے تو تب ہی استغاثہ کی کاروائی میں وہ میٹریل طلب کیا جا سکتا ہے

اور اس بنیاد پر ہی سزا و جزا کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس JIT کی معطلی کا حکم ختم کر کے اس کا اپنے کام کو مکمل کرنا لازم و ضروری ہے تاکہ تمام ریکارڈ کو طلب کر کے صفحہ مسل پر لایا جا سکے۔

☆ انسداد دہشت گردی عدالت لاہور نے سانحہ ماڈل ٹاؤن استغاثہ کیس میں مرکزی ملزمان کو طلب نہ کیا تو اس حکم کے خلاف مستغیث نے معزز عدالت عالیہ لاہور سے رجوع کیا جو بآور ثابت نہ ہوا اور مستغیث استغاثہ نے لاہور ہائی کورٹ کے حکم کے خلاف عدالت عظمیٰ پاکستان میں Crl.P.L.A No 1039/18 دائر کر دی، جو تا حال سماعت کے لیے مقرر نہ ہوئی ہے۔

☆ جسٹس باقر نجفی کمیشن رپورٹ سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین کو مل گئی تھی۔ جس میں سانحہ ماڈل ٹاؤن میں قتل و غارت گری کرنے کا ذمہ دار 2014ء کی پنجاب حکومت اور پنجاب پولیس کو ٹھہرایا ہوا ہے۔ لیکن جسٹس باقر نجفی کمیشن رپورٹ کے ساتھ منسلکہ دستاویزات جس میں ملزمان کے بیان حلفی ٹیلی فون ڈیٹا ریکارڈ، حساس اداروں کی رپورٹس و دیگر دستاویزات شامل ہیں، وہ تمام دستاویزات سانحہ کے متاثرین کو آج تک فراہم نہ کی گئی۔ ان تمام منسلکہ دستاویزات کے حصول کے لیے 2018ء میں لاہور ہائی کورٹ میں رٹ دائر کی ہوئی ہے جو کہ ابھی تک لاہور ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے جس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔

☆ انسداد دہشت گردی عدالت لاہور نے ہمارے 5 مرکزی ملزمان (سابق ڈی سی او لاہور کیپٹن (ر) محمد عثمان، سابق آئی جی پنجاب مشتاق احمد سکھیرا، سابق ڈی آئی جی آپریشنز رانا عبدالجبار، سابق ایس پی ماڈل ٹاؤن لاہور طارق عزیز، سابق ٹی ایم او نشتر ٹاؤن لاہور علی عباس بخاری) کو استغاثہ کیس میں k/265 ضابطہ فوجداری کے تحت بری کر دیا ہے اور سانحہ کے مزید 8 ملزمان نے بھی انسداد دہشت گردی عدالت لاہور میں بریت کے لیے k/265 ضابطہ فوجداری کے تحت درخواستیں دے رکھی ہیں۔

اِن پولیس افسران کی بریت سے یہ امر متحقق ہو گیا ہے کہ انصاف کا نظام ظلم کا نظام بن چکا ہے۔ ایک منصوبہ بندی کے تحت ملزموں نے ٹرائل کورٹ میں بریت کی درخواستیں دی ہیں۔ اگر ملزمان ٹرائل کورٹ سے بریت کے سرٹیفکیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر اگر جے آئی ٹی کو کام کرنے کی اجازت مل بھی گئی تو انصاف نہیں ہو سکے گا کیونکہ قانون کے مطابق ایک کیس میں کسی پر دو بار مقدمہ نہیں چل سکتا۔ لگتا ہے یہ محض اتفاق نہیں ہے بلکہ ایک پلاننگ کے ساتھ شہداء کے ورثاء کے ساتھ قانونی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

سپریم کورٹ کے حکم سے پنجاب حکومت کی طرف سے 14 جنوری 2019ء میں اے ڈی خواجہ

کی سربراہی میں تشکیل دی جانے والی نئی JIT جسے لاہور ہائی کورٹ نے 22 مارچ 2019ء کو معطل کر دیا تھا، اس JIT کی بحالی سے ہی سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین کو انصاف ملے گا۔

اس JIT کو معطل کرنے کی دلیل یہ پیش کی گئی تھی کہ چونکہ پہلے سے ہی اس سانحہ پر ایک JIT موجود ہے جو اپنی تفتیش کر چکی ہے (حالانکہ اُس پہلی JIT) نے مکمل طور پر متعصبانہ طرزِ عمل اختیار کیا اور متاثرین کے بجائے ملزمان کی پشت پناہی کی اور ہم اس پر پہلے ہی دن سے عدم اعتماد کا اظہار کر چکے تھے) جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سیکشن 19 انسداد دہشت گردی ایکٹ 1997ء کے تحت ایک سے زائد JIT بنانے میں کوئی قانونی رکاوٹ نہ ہے۔ جب تک کسی مقدمہ کا فیصلہ نہ ہو جائے، اس وقت تک دوبارہ تفتیش ہو سکتی ہے، اگر عدالت میں مقدمہ کا چالان اور فردِ جرم بھی عائد ہو جائے تو بھی دوبارہ تفتیش سے روکا نہیں جا سکتا ہے۔

☆ غیر جانبدار تفتیش سے ہی انصاف کا عمل ٹریک پر آئے گا۔ کسی بھی مقدمہ کے انصاف کے لیے شفاف تفتیش کا ہونا ضروری ہے۔ شفاف ٹرائل اس وقت تک ناممکن ہے جب تک شفاف تفتیش نہ ہو۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ شفاف ٹرائل تو دور کی بات ابھی تک سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین کو غیر جانبدار تفتیش کا حق جو عدالت عظمیٰ نے دیا تھا اور JIT کی تفتیش جو آخری مراحل میں تھیں، معزز عدالت عالیہ لاہور نے اس کو روک کر تاحال اس پر آج تک کوئی فیصلہ نہ دیا ہے۔ معزز عدالت عالیہ لاہور اور معزز عدالت عظمیٰ پاکستان میں زیر سماعت درخواست ہائے کے فیصلہ کے بغیر ٹرائل کو جاری رکھنا انصاف کا قتلِ عام ہے۔

سانحہ ماڈل ٹاؤن کے حصولِ انصاف کی جد وجہد کو 11 سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی قائد تحریک منہاج القرآن شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی ذاتی دلچسپی اور راہنمائی میں انسداد دہشت گردی عدالت سے لے کر سپریم کورٹ تک مسلسل قانونی چارہ جوئی پوری طاقت، عزم، استقامت کے ساتھ جاری وساری ہے اور ان شاءاللہ تعالیٰ اُس وقت تک جاری رہے گی جب تک سانحہ ماڈل ٹاؤن کے متاثرین اور شہداء کے لواحقین کو انصاف نہیں مل جاتا اور اس سانحہ میں ملوث عناصر کیفرِ کردار تک نہیں پہنچ جاتے۔

مقصدِ حیات اور فلسفۂ مزاحمت

گزشتہ سے پیوستہ

پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری

دنیا میں آنے سے قبل اللہ رب العزت نے انسان کی سرشت میں اس کا مقصد ودیعت فرمادیا تھا۔ مقصدِ حیات کا شعور اللہ تعالیٰ جنھیں عطا کر دیتا ہے، انھیں لگن، شوق، جذبہ اور عشق کی آگ نصیب ہو جاتی ہے مگر پھر بھی وہ کامیابی کی ان منازل کو حاصل کرنے کے بعد تڑپتے رہتے ہیں، ان کی روح بے قرار رہتی ہے اور وہ ہمیشہ حصولِ مقصد کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ اس کی ایک بہت ہی خوبصورت مثال حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا ایک واقعہ ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جلیل القدر ائمہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ تصوف، عقائد، فلسفہ، اصلاحِ احوالِ امت اور اخلاقیات کے باب میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ آج اسلامی دنیا میں کوئی کتاب ان کے حوالہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اس واقعہ کو پڑھنے کے بعد ہمیں احساس ہوگا کہ اگر امام غزالیؒ جیسی شخصیت اِن کیفیات میں مبتلا تھی تو پھر ہماری بے فکری ہمیں کس انجام سے دوچار کردے گی۔

امام غزالیؒ بیان فرماتے ہیں کہ جب میں جوانی کی دہلیز پار کر کے اپنی عملی زندگی میں آیا تو اللہ تعالیٰ مجھے اتنی شہرت اور علمی مقام و مرتبہ عطا فرما چکا تھا کہ میں جلد ہی بادشاہِ وقت کا نورِ نظر بن گیا تھا۔ بادشاہ نے کوئی فیصلہ کرنا ہوتا یا دین کا کوئی مسئلہ پوچھنا ہوتا تو وہ مجھ

سے ہی پوچھتا اور جو میں کہہ دیتا تو اس علاقے اور اُس دور کا ہر عالمِ دین میری بات پر سرِ تسلیم خم کرلیتا۔ عرب و عجم سے بڑے بڑے علماء دور دراز سے سفر کر کے میری مجالس میں زانوئے تلمذ تہہ کرتے۔ اس وقت بغداد شہر کے اندر میری مجلس سے بڑھ کر کوئی مجلس مشہور نہ تھی۔ طول و عرض سے لوگ کشاں کشاں میرے پاس آتے۔ اللہ رب العزت نے رتبہ اور شہرت دے رکھی تھی اور بادشاہ کی طرف سے انعام و اکرام اور نوازشات کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا اور خطابات کے ذریعے بھی دین کی خدمت ہو رہی تھی۔ الغرض یہ ساری شہرت، عزت، نام اور وسائل اللہ رب العزت نے دین کی خدمت کے توسل سے عطا کر رکھے تھے۔ گویا مادی حوالے سے زندگی میں سکون ہی سکون تھا۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اس کے باوجود میں ایک بے قراری اور بے چینی میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے اپنی پریشانی کا ذکر اپنے دوستوں سے کیا کہ مجھے جو کچھ علم حاصل ہے، صبح و شام اپنی تصنیف و تالیف اور خطابات کے ذریعے اسے لوگوں سے بیان کرتا رہتا ہوں۔ میں جو کچھ بیان کرتا ہوں، مجھے اس پر یقین ہے، وہ قرآن و سنت سے ہے اور درست ہے، لیکن میری پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ میں جن بزرگوں کے احوال و واقعات بیان کرتا ہوں، جب ان کے احوال و کیفیات کو اپنے آپ میں نہیں دیکھتا تو گھبرا جاتا ہوں کہ میں علم الیقین کے بعد عین الیقین کی کیفیت کو کیوں حاصل نہیں کر پا رہا؟

علم الیقین سے عین الیقین تک کا سفر

گویا اعلیٰ علمی و فکری مقام و مرتبہ پر پہنچنے کے باجود امام غزالی محسوس کرتے ہیں کہ جن بزرگانِ دین کے واقعات کو میں پڑھتا اور بیان کرتا ہوں، ان بزرگانِ دین کو حاصل مشاہدات اور کیفیات سے میں کیوں محروم ہوں۔۔۔؟ مجھے وہ تجلیات کیوں نظر نہیں آ رہیں۔۔۔ وہ کیفیات مجھے کیوں نصیب نہیں ہو رہیں۔۔۔ میں علم الیقین سے عین الیقین تک کیوں نہیں پہنچ پا رہا۔ پس یہ سوچ و فکر ان کے لیے باعثِ تشویش بن گئی تھی۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ جنھیں مقصدِ حیات کی لگن لگ جاتی ہے تو پھر وہ صرف ظاہری کامیابی پر اکتفا نہیں کرتے کہ 'یہی دین کا راستہ ہے، یہی درست راستہ ہے اور دین کی خدمت کی وجہ سے جو مقام و مرتبہ مل گیا ہے، اتنا کافی ہے۔' نہیں بلکہ انہیں خوف ہوتا ہے کہ اگر

میں اس دنیا سے اسی کیفیت میں چلا گیا اور مجھے علم الیقین کے بعد عین الیقین حاصل نہ ہوا تو یقیناً خدمتِ دین کے نتیجے میں جنت تو مل جائے گی لیکن جو مقصدِ حیات تھا، اگر وہ حاصل نہ کر پایا تو اللہ رب العزت کی بارگاہ میں کیا جواب دوں گا۔ امام غزالیؒ کو بھی یہی فکر دامن گیر تھی کہ وہ کیفیات ومشاہدات، جن کا تذکرہ میں اپنے خطابات اور تصنیفات میں کرتا تھا، اگر وہ نہ پاسکا، ان کیفیات کو محسوس نہ کر سکا اور ان مشاہدات کو اپنی نگاہ سے نہ دیکھ پایا اور بن دیکھے اور محسوس کیے دنیا سے رخصت ہو گیا، تو کیا بنے گا؟

جب امام غزالیؒ نے اپنے دوستوں سے اپنی اس پریشانی کا ذکر کیا تو ان کے دوست احباب کہنے لگے کہ غزالی! اس سوچ اور کیفیت کے سبب، یہ عہدہ و منصب اور بادشاہِ وقت کی قربت وخدمت کا اعزاز نہ چھوڑنا۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد یہ سوچ اور کیفیت چلی جائے لیکن بعد میں یہ مقام ومرتبہ ڈھونڈنے سے بھی آپ کو نہیں ملے گا۔

امام غزالیؒ کے دوست احباب کے ساتھ ساتھ آپ کے گھر والے بھی پریشان تھے کہ آسائش اور آرام دہ زندگی ہے، سکون میسر ہے، شاید کچھ دن بعد یہ کیفیت چلی جائے، اگر موجودہ منصب ومقام ترک کر دیا تو بعد میں اس پر پچھتاوے کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ سب کچھ چھوڑ دوں اور کہیں دور چلا جاؤں لیکن ہر بار ارادہ ملتوی کر دیتا۔ ایک عرصہ کے بعد میں نے اللہ رب العزت کے حضور ہمت، استقلال اور ارادہ کی مضبوطی و پختگی کے لیے دعا کی۔ کچھ عرصہ بعد اللہ رب العزت نے مجھ سے میرے بولنے کی طاقت سلب کر لی اور میرا بولنا بند ہو گیا۔ اب میں ارادہ کر کے بھی کلام نہیں کر سکتا تھا۔ پہلے لوگ میرے علم وفکر کی وجہ سے میرے پاس آتے تھے اور میں انھیں وعظ ونصیحت کرتا تھا مگر اب بولنے کی طاقت کے سلب ہونے کے بعد میں ان کے کسی کے کام کا نہ رہا۔ لوگ میری مجالس میں آتے مگر میں ان سے خطاب نہ کر سکتا۔ نتیجتاً رفتہ رفتہ لوگوں کی دلچسپی مجھ سے ختم ہونے لگ گئی۔

اب میرے لیے اپنے ارادے پر عمل کرنا آسان ہو گیا تھا۔ چنانچہ جو وسائل میسر تھے، میں نے اپنے بچوں کے حوالے کیے اور حج کے لیے عازمِ سفر ہوا۔ حج کے بعد کسی کو آگاہ کیے بغیر شام چلا گیا اور گمنامی کی زندگی بسر کرنے لگا۔ میں اسی فکر میں تھا کہ عین الیقین کے درجے پر کیسے پہنچوں۔ میں بڑے بڑے علماء، فقہاء اور مشائخ کی مجالس میں بیٹھا لیکن پھر بھی علم الیقین سے آگے نہ بڑھا۔ فلاسفہ اور متوکلین کے پاس بیٹھا کہ وہاں سے مجھے علم الیقین

سے کچھ آگے کی خبر ملی۔ ایک عرصہ تک میں سمجھتا رہا کہ یہی راستہ ہے مگر بعد ازاں وہاں بھی مجھے علم الیقین سے آگے کی کچھ خبر نہ ملی۔ میں نے انھیں بھی چھوڑا اور پھر صوفیاء واولیاء کی مجلس کو اختیار کیا۔ یہاں میں نے ریاضت و مجاہدہ کرنا شروع کیا۔ کبھی دمشق کی کسی مسجد کے مینار میں اور کبھی کسی مسجد کے گوشے میں، خلوتوں میں محوِ جستجو رہا۔ میں دس سال دنیا چھوڑ کر کیفیاتِ عشق کی دریافت میں سرگرداں رہا۔

اس دوران کبھی کبھی مجھے یہ خیال بھی آتا تھا کہ پہلے زندگی میں دین کا کام تو کرتا تھا، اب تو وہ بھی نہیں کرتا۔ لیکن پھر میں اپنے اندر جھانک کر دیکھتا تو احساس ہوتا کہ ہو سکتا ہے وہ سب اعمال اللہ کے حکم سے نہ کرتا رہا ہوں اور قیامت کے دن اگر اللہ پوچھ لے کہ غزالی وہ سب کچھ میرے لیے تو نہیں کر رہا تھا تو کیا جواب دوں گا؟ یہ سوچ کر میں واپس پلٹ جانے کے خیال کو ترک کر دیتا۔

الغرض ان تمام احساسات کے سبب امام غزالیؒ نے ہر شے ترک کر دی۔ دس سال کے دورانیہ میں ایک دو مرتبہ ہی اہل و عیال سے ملنے کے لیے گئے، بقیہ تمام عرصہ خلوت اور گمنامی میں زندگی بسر کرنے لگے۔

دس سال بعد خواب میں تاجدار کائنات ﷺ تشریف لائے اور حکم فرمایا کہ غزالی! جاؤ، اب شہرِ بغداد لوٹ جاؤ۔ اب ہم حکم دے رہے ہیں کہ میرے دین کی خدمت

کرو۔امام غزالی فرماتے ہیں کہ ان دس سالوں میں مجھے جلوت سے اتنی بیزاری ہوگئی تھی کہ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ واپس لوگوں کی طرف لوٹ جاؤں۔ میں یہ سوچ کر رُک گیا کہ ایک دو دن تک جاتا ہوں۔

کچھ روز بعد حضور نبی اکرم ﷺ دوبارہ خواب میں تشریف لائے اور پھر فرمایا کہ غزالی! میں نے کہا ہے کہ واپس شہرِ بغداد لوٹ جاؤ اور میرے دین کا کام کرو۔ فرماتے ہیں کہ اس مرتبہ بھی مجھ سے سستی ہوئی اور میں بغداد روانہ نہ ہوا۔

تیسری بار تاجدار کائنات ﷺ نے پھر حکم فرمایا کہ غزالی اب دین کی خدمت کے لیے لوٹ جا، اللہ رب العزت تیرے نام کو اور کام کو رہتی دنیا تک کے لیے امتِ محمدیہ کے لیے نمایاں کردے گا۔

میں خوفزدہ ہوگیا کہ اب میری طبیعت کی سستی کہیں گستاخی تصور نہ ہو، لہذا میں نے سب کچھ چھوڑا اور بغداد شہر واپس پلٹ گیا اور از سرِ نو خدمتِ دین، وعظ و نصیحت اور اصلاحِ احوال کا کام شروع کردیا۔

مزاحمت؛ قبولیت کی علامت ہے

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اس دوران میں نے احیاء العلوم الدین لکھنا شروع کی۔ اب میں دین کی جو خدمت سرانجام دے رہا تھا، وہ آقا علیہ الصلوۃ والسلام کے حکم اور فرمان کے مطابق تھی لیکن اِس دور اور پہلے والے دور میں فرق یہ تھا کہ پہلے جب کلام کرتا تھا ، لکھتا تھا تو تعریف کی جاتی تھی اور اب میں وعظ و نصیحت کرتا یا کتابیں لکھتا تو ہر کوئی مذمت کرتا تھا۔ اب میری مجلس ویران نظر آنے لگی اور میری کتب جلائے جانے لگیں۔ پہلے جب اپنی مرضی سے کرتا تھا تو ہر طرف سے تعریف اور داد ملتی تھی اور اب جب آقا علیہ السلام نے اس فریضہ پر مامور فرمایا ہے تو مخالفتوں اور مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

یاد رکھیں! مزاحمتوں کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ جب کوئی ذمہ داری اور نوکری پر آتا ہے تو مخالفت ساتھ لاتا ہے لیکن جب انسان اپنے نفس کے نتیجے میں کچھ کر رہا ہوتا ہے تو ہر طرف سے داد مل رہی ہوتی ہے۔ اس لیے دین کے کام میں جب مزاحمت ہو تو یہ نہ سمجھیں کہ میں ناکام ہوں یا مولا مجھ سے ناراض ہے بلکہ یہ مزاحمت اور مخالفت جتنی بڑھتی چلی جائے، جان لیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ اسی قدر زیادہ راضی ہیں۔ یہ ان

نوجوانوں کے لیے پیغام ہے جو مزاحمت سے گھبرا کر ڈپریشنز کا شکار ہوجاتے ہیں۔یاد رکھیں!مزاحمت تو قبولیت کی علامت بن کرآتی ہے۔

امام غزالیؒ بھی ان مزاحمتوں اور مخالفتوں سے پریشان ہوکر سوچنے لگے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے حکم سے آیا ہوں اور آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ غزالی! تیری بات گھر گھر پہنچ جائے گی مگر یہاں تو ایسا نظر نہیں آرہا ہے۔اسی پریشانی میں مبتلا تھے کہ ایک رات خواب میں آقا علیہ الصلوۃ والسلام اپنے دستِ مبارک میں آپ کی کتاب ''احیاء العلوم الدین'' اٹھائے ہوئے تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ غزالی!کیوں دکھی ہوتا ہے، کیا اس پر راضی نہیں کہ تیرا لکھا ہوا ہم پڑھتے ہیں۔ صبح اٹھے تو دل کی کیفیت بدل چکی تھی۔ اب آپ ہر ایک سے بے نیاز ہوگئے کہ حضور علیہ السلام کے ہاں میری لکھی ہوئی تحریر مقبول ہے تو زمانہ کچھ بھی سمجھے،اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

پھر امام غزالیؒ کے افکار کی قبولیت کی انتہا یہ ہوئی کہ مسلمان تو مسلمان عالمِ مغرب کے مسیحی اور یہود تک نے آپ سے استفادہ کیا۔ قارئین کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ امام غزالی کی کتب سے مسلم دنیا کے تمام علماء میں سے بھی سب سے زیادہ اہل یہود نے استفادہ کیا ہے ۔ان کا عقیدہ قبالہ مکمل طور پر امام غزالی کی فکر کا نچوڑ ہے۔امام غزالی کی تعلیمات کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ عالِم مغرب میں جب اخلاقی تنزل شروع ہوا تو ان کے مزاج کے مطابق تو جتنی بھی روحانی تحریکیں وہاں پر چلیں، وہ امام غزالی کی تعلیمات سے فیض یافتہ تھیں۔

مزاحمت: اللہ تعالیٰ کا اصولِ نشوونما

یاد رکھیں! وہ مزاحمت جس سے ہم گھبراتے ہیں، دراصل اللہ رب العزت کا اصولِ نشوونما ہے۔ اللہ رب العزت اس مزاحمت کو انسان کی شخصیت کو بنانے اور سنوارنے کے لیے ہی پیدا فرماتا

ہے۔اگر کسی کو اپنے دورِ مزاحمت کے بعد اللہ رب العزت اچھے حالات عطا کر دے مگر اس کا رویہ اور مزاج منفی ہو جائے یا سخت ہو جائے کہ میرے ساتھ یہ لوگ ایسا کرتے تھے، اب میں ان سے دو گنا برا رویہ رکھوں گا تو اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو قانون اس کی شخصیت کو سنوارنے کے لیے اسے عطا کیا، وہ اسے سمجھا ہی نہیں کہ اس کی شخصیت و کردار کو بنانے کے لیے اللہ رب العزت نے اسے مزاحمت کے تصور میں ڈالا تھا۔

کائنات میں کوئی بھی شے مزاحمت کے بغیر وجود نہیں رکھتی۔اللہ رب العزت نے انسان کی شخصیت میں بہت سارے جواہر پیدا فرمائے ہیں۔ان جواہر کو فعال کرنے کے لیے مزاحمت در کار ہے اور یہی مزاحمت اس کے اندر پوشیدہ خصوصیات کو نکھارتی ہے۔ ایک معروف قول ہے کہ مشکل حالات بڑے انسان پیدا کرتے ہیں۔۔۔بڑے انسان اچھے حالات پیدا کرتے ہیں۔۔۔اچھے حالات کمزور انسان پیدا کرتے ہیں۔۔۔ اور پھر کمزور انسان برے حالات پیدا کرتے ہیں۔۔۔ اور پھر وہ برے حالات مضبوط شخصیات پیدا کرتے ہیں۔

پس فلسفہ مزاحمت یہ ہے کہ انسان جس قدر سخت حالات کے اندر پرورش پاتا ہے، اس کی پوشیدہ خصوصیات اتنی ہی نکھر کر سامنے آتی ہیں۔اس کو اس مثال سے سمجھیں کہ پاکستانی ڈاکٹرز کی پوری دنیا میں شہرت اور نیک نامی ہے، اس کے پیچھے بھی یہی فلسفہ مزاحمت ہے۔ وہ سخت حالات کے اندر ٹریننگ لیتے ہیں، ہسپتالوں کے ناگفتہ بہ حالات، وسائل و ادویات کی کمی، ایک ایک بیڈ پر دو تین مریض وغیرہ، وہ ان تمام حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ اپنی عقل کا زیادہ استعمال کرتے ہیں، نتیجتاً مریض ٹھیک کر دیتے ہیں۔ اپنی ٹریننگ کے دوران کے ان برے حالات کے نتیجے میں وہ ذہین ڈاکٹرز بن جاتے ہیں جبکہ اس کے برعکس جہاں پر بہت زیادہ Technology, Advancement, comfirtability ہے، ان کا انحصار 100 فیصد ٹیسٹ کے اوپر ہے۔ مریض ٹیسٹ کروا کر آئے تو جواب ملے گا کہ ہم رپورٹ دیکھ کر بتائیں گے۔ وہ خود سے اپنی عقل استعمال کرنا بھول جاتے ہیں۔

یاد رکھیں! ہم جو مشکل کام کرتے ہیں، اسی کے سبب ہماری پوشیدہ صلاحیتیں نکھر کر سامنے آتی ہیں۔ اگر ہم ساری زندگی آرام دہ ماحول میں رہیں تو پھر تھوڑی سی مشکل بھی ہمارے لیے موت ثابت ہو گی۔اس کے برعکس اگر ہم اپنے آپ کو مستعد اور فعال رکھتے ہیں، بھاگ دوڑ کرتے ہیں، جِم کرتے ہیں، ایکسرسائزز کرتے ہیں، مزدوری کرتے ہیں ،جسمانی مشقت کرتے ہیں اور بھوک و پیاس برداشت کرتے ہیں تو اس سے ہمارے اندر برداشت کا مادہ بڑھ جاتا ہے۔

رنج سے خو گر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آسان ہو گئیں

یہی مشقت اور چیلنج دین کی عبادات میں بھی ہے۔ بزرگانِ دین اور اہل اللہ رات دیر تک ریاضت کرتے تھے، طویل قیام وسجدے کرتے تھے، قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے ،ذکر واذکار کرتے تھے، لیکن تھکتے نہیں تھے۔آج ہم معمولی سی مشقت کو برداشت نہیں کر پاتے اور تھک جاتے ہیں کیونکہ ہم نے اپنے جسم کو اس طرح کی مشقتوں کا عادی نہیں بنایا، جسم کو اس طرح کے چیلنجز نہیں دیے اور مزاحمت کے دور میں اپنے جسم، ذہن اور سوچوں کو دورِ مزاحمت میں ابھرنے والے چیلنجز کا مقابلہ کرنا نہیں سکھایا۔ نتیجتاً مطلوبہ صلاحیتیں ہمارے اندر سے ابھر کر سامنے نہیں آتیں۔جوں جوں آرام پسندی بڑھتی چلی جاتی ہے، کمزور لوگ پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں، جن کے اندر تحمل و برداشت کا فقدان ہوتا ہے۔مزاحمت کے اس عمل کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

یاد رکھیں! مزاحمت ہمارے نقصان کے لیے نہیں بلکہ یہ ہمیں بنانے کے لیے ہے۔اللہ رب العزت نے کائنات کا بھی یہی اصول رکھا ہے۔ اگر ہم کائنات کا تجزیہ کریں تو یہ کائنات بھی ایک مزاحمت کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔بگ بینگ تھیوری بھی ایک مزاحمت کا نام ہے، جس سے ہر ایک چیز وجود میں آئی ہے۔

اسی طرح آج دنیا میں کوئی اچھا کاروباری بننا چاہتا ہے تو جتنا وہ اپنے آپ کو چیلنج کرے گا، جتنی زیادہ محنت کرے گا، اتنا ہی کامیاب کاروباری بن جائے گا۔اگر کوئی سوچے کہ میں پر سکون بھی رہوں، صرف ضروریات زندگی پوری ہوتی رہیں، یہی کافی ہے تو وہ بڑا کاروباری نہیں بن سکتا، کیونکہ وہ مشقت اور محنت نہیں کرتا۔

استاد اگر تحقیق میں محنت نہیں کرے گا تو وہ بڑا عالم نہیں بنے گا۔جو جتنی کوشش کرے گا، اسے اتنا ملے گا، جتنی محنت کرتا چلا جائے گا، اتنی ہی منفعت بڑھتی چلی جائے گی۔ روحانی عبادت، ریاضت، معرفت اور کرامت ہر شے میں یہی تصور ہے کہ انسان جس راہ میں جس قدر اپنے آپ کو مشقت وریاضت کا خو گر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اسی حساب سے عطا کرتا ہے۔

پرانے ادوار کے صوفیاء ریاضتوں اور مشقتوں میں بہت آگے تھے، اس لیے ان کا مقام بھی اونچا تھا۔ ہم لوگ بہت کمزور اور ناقص ہیں اور آسانیوں و آسائشوں میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے اخلاص کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اتنا دے دیتا ہے جس سے گزارا ہوتا رہتا ہے لیکن ریاضت

کی کمی کی وجہ سے اتنا نہیں دیتا کہ ہم زمانے میں ایک منفرد و ممتاز مقام کے حامل ہو جائیں۔ یہ ہر انسان کا اپنا سودا اور اپنی سمجھ ہے۔ مزاحمت کا اصول اپنی جگہ پر قائم ہے، اسے سمجھنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنانے کی ضرورت ہے اور اپنے مقاصد کی طرف یکسو ہونا ناگزیر ہے۔

ظاہری اور باطنی مزاحمت

مزاحمت دو طرح کی ہوتی ہیں:

۱۔ خارجی و ظاہری مزاحمت ۲۔ باطنی مزاحمت

خارجی مزاحمت باہر سے ہوتی ہے اور باطنی مزاحمت اندر سے ہوتی ہے۔ خارجی مزاحمت پر صبر کرنا سیکھیں اور باطنی مزاحمت کی مزاحمت کریں۔ ہم اس کے برعکس کرتے ہیں۔ خارجی مزاحمت کی مزاحمت کرتے ہیں جبکہ سستی، کاہلی، نفس کی آلائشیں اور خواہشات کے خلاف باطنی مزاحمت نہیں کرتے بلکہ اسے قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔ باطنی مزاحمت یہ ہے کہ جو خواہش ہمیں کام سے روکے اور ہماری کیفیات، اخلاص اور خیر کے کام کی انجام دہی میں رکاوٹ ڈالے تو اس کی مزاحمت کریں، اس کو توڑیں اور اس سے جنگ کریں۔

خارجی مزاحمت یہ ہے کہ باہر سے آنے والی دشمنیوں اور مخالفتوں پر صبر کریں، اس پر اپنا وقت اور طاقت کو ضائع نہ کریں کہ 'فلاں میری مخالفت کرتا ہے، اس نے مجھے یہ کہا، اس نے مجھ سے برا سلوک کیا، اس نے میری عزت اور تکریم نہیں کی، اس نے میری کام کی توقیر نہ کی'، یہ سب خارجی مزاحمتیں ہیں۔ اس خارجی مزاحمت پر صبر کریں، نظر انداز کریں اور بے نیاز ہو جائیں۔ پس جب نفس کی طرف سے مزاحمت ہو تو اس کی مزاحمت کریں، اسے توڑیں، اس سے جنگ کریں اور اس پر فتح حاصل کریں اور جب خارجی عوامل اور تعلقات کی طرف سے مزاحمت ہو تو اس پر صبر کریں۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے ظاہری و باطنی دونوں طرح کے مقصدِ حیات میں کامیابی عطا فرمائے، مقصدِ حیات کے انتخاب میں بہتر فیصلے کرنے کی صلاحیت عطا فرمائے اور خارجی مزاحمتوں پر صبر اور اندرونی مزاحمتوں پر مزاحمت کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

فاؤنڈنگ ممبرز ڈے کے موقع پر تقریب کا انعقاد

خصوصی رپورٹ

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری اسلاف کی اقدار کے امین اور نہایت باوقار شخصیت کے مالک ہیں، اُن کے لاتعداد اوصاف میں سے ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ اپنے دوستوں اور تحریک منہاج القرآن کے لیے کسی بھی مرحلہ پر قربانیاں دینے والے احباب کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ وہ تحریک منہاج القرآن کے اوائل دور کے ایک ایک ساتھی کو نام اور ان کے کام کے ساتھ جانتے اور پہچانتے ہیں۔ یہ فتنوں، مادیت پرستی اور افراتفری کا دور ہے، جس دور میں ہاتھ کو ہاتھ نہیں پہچانتا اس دور میں بھی شیخ الاسلام اپنے ساتھیوں، دوستوں اور مشن کے مخلصین کو یاد رکھے ہوئے ہیں۔ جب شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے تحریک منہاج القرآن کی بنیاد رکھی تو آپ کے شانہ بشانہ چلنے والے افراد وہ خوش قسمت احباب ہیں کہ جنھوں نے مصطفوی مشن کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچانے کا خواب آنکھوں میں سجایا اور پھر اپنی زندگیوں میں اس خواب کو شرمندہ تعبیر ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔

تحریکِ منہاج القرآن کے قیام کے وقت شیخ الاسلام کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو اس مصطفوی مشن کے لیے وقف کرنے والی ان عظیم شخصیات کے اعزاز میں 3 مئی

2025ء بروز ہفتہ مرکزی سیکرٹریٹ لاہور میں ایک پروقار تقریب بعنوان ”فاؤنڈنگ ممبرز ڈے“ منعقد ہوئی۔ جس کا اہتمام ”کونسل آف فاؤنڈنگ اینڈ سینئر ممبرز“ نے کیا۔ یہ تقریب ایک تاریخ ساز اجتماع تھا، جس میں وفا، اخلاص، ایثار اور استقامت کی خوشبو ہر سمت پھیلی ہوئی محسوس ہوئی۔

☆ تقریب کی صدارت صدر تحریک پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری نے کی۔ تقریب کا مقصد اُن شخصیات کو خراجِ تحسین پیش کرنا تھا، جنہوں نے مصطفوی مشن کے فروغ کے لیے خدمات انجام دیں۔ نائب ناظم اعلیٰ محترم علامہ رانا محمد ادریس نے تقریب میں تشریف لائے ہوئے مہمانانِ گرامی کا ایک جامع تعارف پیش کیا۔ محترم شہزاد رسول قادری (سیکرٹری کونسل آف فاؤنڈنگ ممبرز) نے تمام مہمانانِ گرامی کو خوش آمدید کہتے ہوئے کہا کہ آپ وہ شخصیات ہیں جنہوں نے تحریک کی پہچان بنائی اور نئی نسل کو دینی شعور سے آشنا کیا۔ آپ کا وجود ہمارے لیے سرمایہ افتخار ہے۔ تقریب میں محترم علامہ غلام مرتضیٰ علوی نے نقابت کے فرائض سرانجام دیے۔

☆ ناظم اعلیٰ محترم خرم نواز گنڈاپور نے استقبالیہ کلمات میں فاؤنڈنگ ممبرز کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ شخصیات وہ ہیں جنہوں نے شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا دست و بازو بنتے ہوئے تحریک منہاج القرآن کی بنیاد رکھی اور اپنے خلوص، استقامت اور دینی جذبے سے اسے پروان چڑھایا۔ بانی اراکین کی خدمات تحریک منہاج القرآن کے تمام کارکنان کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ آج ہم جن کامیابیوں پر فخر کرتے ہیں، ان کی بنیاد انہی مخلص راہنماؤں نے رکھی تھی۔ ہمیں ان سینئر راہنماؤں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنے عظیم قائد شیخ الاسلام کی راہنمائی میں تحریک منہاج القرآن کو مزید مستحکم بنانا ہے۔

☆ تقریب سے محترم حاجی محمد امین القادری نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تحریک منہاج القرآن، دینِ مصطفوی ﷺ کی ترویج، امتِ مسلمہ کی اصلاح اور انسانیت کی خدمت کے عظیم مشن پر کاربند ہے۔ یہ کارواں تھما نہیں، بلکہ ہر لمحہ آگے بڑھ رہا ہے۔

☆ صدر تحریک منہاج القرآن انٹرنیشنل، پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ لمحہ ہمارے لیے باعثِ فخر و سعادت ہے کہ ہم اُن عظیم شخصیات کے ساتھ بیٹھے ہیں، جنہوں نے اپنے خونِ جگر سے اس عظیم مصطفوی مشن کی آبیاری کی۔ یہ اللہ کا خاص کرم ہے کہ ہماری زندگیاں دینِ حق کی سربلندی کے لیے وقف ہوئیں۔ بانیانِ تحریک کو اپنے لقب ”السابقون“ کی عملی تعبیر بننا ہے۔ ان کا مرکز سے تعلق محض یادگار نہیں بلکہ ایک زندہ روایت ہے، جسے آئندہ

نسلوں تک محبت، تربیت اور عمل کے ساتھ منتقل کرنا ہو گا۔ یہ نسبتِ مصطفوی، جو ہمیں شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے ذریعے عطا ہوئی، آنے والی نسلوں کے دلوں میں راسخ کرنی ہے۔

☆ اس تقریب میں ناظمِ اعلیٰ، نائب ناظمین اعلیٰ، مرکزی قائدین نے خصوصی شرکت کی اور سینئرز فاؤنڈنگ ممبرز کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس تقریب میں جن فاؤنڈنگ ممبرز نے شرکت کی، ان میں؛ محترم حاجی محمد امین القادری، محترم حاجی منظور حسین، محترم حاجی محمد سلیم یوسفی، محترم حاجی محمد سلیم قادری، محترم حاجی محمد الیاس قادری، محترم احمد نعمان شیخ، محترم چودھری جلیل، محترم پروفیسر نواز ظفر، محترم ڈاکٹر شاھد محمود، محترم چودھری افضل گجر، محترم شیخ محمد فاروق، محترم سردار فتح اللہ خان، محترم شیخ محمد عامر رفیع، محترم ابرار حنیف مغل شامل ہیں۔

یہ تقریب ایک رسمی اجتماع سے کہیں بڑھ کر روح کی گہرائیوں میں اتر جانے والا لمحہ تھی، جہاں اخلاص اور وفا کی چمک ہر چہرے سے عیاں تھی۔ یہ محفل اُس نسلِ وفا کے لیے ایک سلام تھی، جنہوں نے تحریکِ منہاج القرآن کے پودے کو اپنے لہو سے سینچا، اور آج بھی وہ شجر سایہ دار بن کر آنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک کے علماء کرام کا مرکزی سیکرٹریٹ منہاج القرآن انٹرنیشنل اور منہاج یونیورسٹی لاہور کا دورہ

گذشتہ ماہ جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک کے معزز علماء کرام کے ایک اعلیٰ سطحی وفد نے امیر جمعیت علمائے اسلام (س) محترم مولانا عبد الحق ثانی کی قیادت میں تحریک منہاج القرآن کے مرکزی سیکرٹریٹ اور منہاج یونیورسٹی لاہور کا دورہ کیا۔ اس وفد میں؛ محترم مولانا حافظ لقمان الحق حقانی، محترم مولانا اسامہ سمیع، محترم مولانا محمد احمد، محترم مولانا اعظم حسین، محترم مولانا رحمت اللہ لاشاری، محترم مولانا تنویر، محترم مفتی اویس، محترم مولانا مامون الرحمن حقانی شامل تھے۔ ناظم اعلیٰ خرم نواز گنڈاپور، انجینئر محمد رفیق نجم (نائب ناظمِ اعلیٰ)، نوراللہ صدیقی (نائب ناظم اعلیٰ)، چوہدری عرفان یوسف (نائب ناظمِ اعلیٰ خیبر پختونخوا)، بریگیڈیئر (ر) عمر حیات (نائب ناظم اعلیٰ) اور دیگر سینئر ذمہ داران نے وفد کا استقبال کیا۔

مرکزی سیکرٹریٹ گوشۂ درود میں مولانا حامد الحق حقانی کی یاد میں ایک تعزیتی ریفرنس کا انعقاد کیا گیا، جس میں ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کی گئی۔ بعد ازاں وفد نے نظام المدارس، فرید ملت ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کالج آف شریعہ اور مرکزی سیکرٹریٹ کے مختلف شعبہ جات کا دورہ کیا۔ جہاں انہیں ان شعبہ جات کی کارکردگی اور خدمات کے بارے میں تفصیلی آگاہی دی گئی۔

وفد نے منہاج یونیورسٹی لاہور کا خصوصی دورہ کیا اور ڈپٹی چیئرمین بورڈ آف گورنرز پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری سے ملاقات کی۔ وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر ساجد محمود شہزاد، رجسٹرار پروفیسر ڈاکٹر خرم شہزاد اور یونیورسٹی انتظامیہ نے وفد کو خوش آمدید کہا۔ اس موقع پر محترم مولانا عبد الحق ثانی نے منہاج یونیورسٹی لاہور کے جدید و قدیم تعلیمی نظام پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ منہاج یونیورسٹی کی تعلیمی خدمات اور علمی معیار نہ صرف قابلِ تعریف ہے بلکہ یہ دینی و دنیاوی تعلیم کے درمیان ایک بہترین توازن قائم کرتے ہوئے جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کا احیاء

بھی کر رہی ہے۔ یہ یونیورسٹی طلبہ کو نہ صرف علمی میدان میں کامیاب بنانے میں مصروفِ عمل ہے بلکہ انہیں روحانیت اور اخلاقی ترقی کی راہ پر بھی گامزن کر رہی ہے۔

ڈاکٹر حسین محی الدین قادری نے وفد سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کا مستقبل علم و تحقیق اور علمی مکالمے کے ساتھ وابستہ ہے، کیونکہ یہی چیزیں اسلامی اخوت، محبت اور بھائی چارے کو بڑھانے کا مؤثر ذریعہ ہیں۔ پاکستان کو آج کے دور میں برادرانہ تعلقات اور خیر سگالی کی فضا کی سخت ضرورت ہے تاکہ ہم معاشرتی ہم آہنگی اور امن کو فروغ دے سکیں۔

اس موقع پر وفد نے منہاج یونیورسٹی میں قائم شیخ الاسلام انسٹی ٹیوٹ آف اسپیچوئل اسٹڈیز، پاکستان کی پہلی روبوٹک لائبریری اور جدید ایڈمیشن بلاک کا معائنہ کیا اور ادارے کی دینی و عصری تعلیم میں خدمات کو سراہا۔

منہاج یونیورسٹی کے زیراہتمام ماحولیاتی تبدیلی کے موضوع پر سیمینار

علم و شعور کی روشنی سے جہالت کی تاریکیوں کو چیرنے والا ادارہ، منہاج یونیورسٹی لاہور، ایک بار پھر بین الاقوامی سطح پر فکری ہم آہنگی، ماحولیاتی شعور، انسانی ہمدردی اور عالمگیر ترقی کے اہداف کو یکجا کرنے میں پیش پیش نظر آیا، جب اس کے اسکول آف پولیٹیکل سائنس نے مورخہ 26 اپریل 2025 کو ایک عظیم الشان بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ یہ کانفرنس نہ صرف علمی و فکری مکالمے کا مظہر تھی بلکہ انسانیت کی فلاح، قدرتی وسائل کے تحفظ، اور دنیا کو بھوک، مہاجرت اور ماحولیاتی آلودگی جیسے خطرات سے بچانے کی ایک منظم کوشش بھی۔

☆ اس کانفرنس کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری (ڈپٹی چیئرمین، بورڈ آف گورنرز، منہاج یونیورسٹی لاہور) نے فرمائی۔ یہ کانفرنس بین الاقوامی فکری مکالمہ کا مظہر تھی، جس میں اندرون ملک کے ساتھ ساتھ بیرون ملک سے بھی ممتاز شخصیات نے شرکت کی۔ بیرون ملک سے تشریف لانے والی شخصیات میں؛ پروفیسر ڈاکٹر فریز باومن (سابق اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل، اقوام متحدہ، امریکہ)، پروفیسر ڈاکٹر افسر راٹھور (سابق ایگزیکٹو، اقوام متحدہ، آسٹریا)، مسٹر مائیکل زنکانیل (ڈائریکٹر آسٹرین انسٹی ٹیوٹ فار یورپین اینڈ سیکورٹی پالیسی، آسٹریا)، مس مائیو ساتو (چیف آف مشن، IOM، پاکستان)، مس فلورنس رولے (نمائندہ FAO، پاکستان)، مس رانا رحیم (ICMPD، پاکستان / کینیڈا)، مس میختھلڈ گیر (آسٹریا) شامل تھیں۔

☆ پروفیسر ڈاکٹر ساجد محمود شہزاد (وائس چانسلر) نے افتتاحی خطاب میں کہا کہ منہاج یونیورسٹی عالمی ترقیاتی ایجنڈے کی علمبردار ہے، جو نہ صرف مقامی بلکہ بین الاقوامی سطح پر ایک جامع، بااختیار اور پائیدار معاشرے کی تشکیل کے لیے کوشاں ہے۔

ڈاکٹر یاسر خان نے کانفرنس کے اغراض و مقاصد اور موضوعاتی وسعت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ کانفرنس انسانیت کو درپیش مہلک خطرات کے خلاف مشترکہ فکری جدوجہد کی بنیاد رکھتی ہے۔

☆ پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری نے ”ماحولیاتی تبدیلی، چیلنجز، قوانین اور کمزور اقوام پر اثرات“ کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے واضح کیا کہ کس طرح ماحولیاتی تبدیلی اور زہریلے فضلے کا غیر منصفانہ اخراج کمزور طبقات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا رہا ہے۔ انہوں نے "زہریلی نوآبادیات" (Toxic Colonialism) کے تصور پر گفتگو کرتے ہوئے ان روشوں پر تنقید کی، جن کے تحت وہ اپنا صنعتی فضلہ ترقی پذیر اقوام پر منتقل کر کے انسانی صحت، حیاتیاتی تنوع اور ماحولیاتی نظام کو خطرات میں ڈال رہا ہے۔ انھوں نے اس اقدام کو 2022ء میں پاکستان میں آنے والے تباہ کن سیلاب اور افریقی خطے میں طویل خشک سالی جیسے مظاہر کو اقوامِ عالم کے لیے ایک وارننگ قرار دیا اور یاد دلایا کہ کرۂ ارض پر کسی ایک خطے کی کوتاہی، سب کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔

ڈاکٹر حسین محی الدین قادری نے ماحولیاتی قوانین اور عالمی معاہدات جیسے کہ کیوٹو پروٹوکول، پیرس معاہدہ اور باسل کنونشن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ان قوانین کی موجودگی کے باوجود عملی سطح پر ان پر عملدرآمد کا فقدان لمحۂ فکریہ ہے۔ فطرت کی حفاظت دراصل انسانی وقار، اخلاقی ذمہ داری اور دینی فریضہ ہے۔ تمام اقوام اپنی سرحدی تنگ نظری کو ترک کر کے مشترکہ انسانی بقا کے لیے اجتماعی اقدام کریں۔ صاف توانائی، مضبوط معیشت اور ذمہ دارانہ طرزِ زندگی ہی کی بدولت مستقبل روشن ہو سکتا ہے۔ یاد رکھیں کہ زمین اللہ کی امانت ہے، اور ہم سب اس کے نگہبان ہیں۔

☆ اس کانفرنس میں درج ذیل تین پینل ڈسکشنز بھی ہوئیں۔ جن میں ملکی و غیر ملکی سکالرز نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا:

۱۔ موسمیاتی تبدیلی اور عوامی شعور: اس موضوع کے تحت ماحولیاتی تعلیم، آگہی مہمات اور تعلیمی اداروں کے کردار پر گہری بصیرت سے بحث کی گئی۔

۲۔ غذائی تحفظ اور بھوک کا خاتمہ: اس عنوان کے تحت میں بھوک کے خاتمے کے لیے عالمی اشتراک، زرعی اصلاحات اور غذائی رسائی کے مساوی مواقع کو زیرِ بحث لایا گیا۔

۳۔ غیر قانونی ہجرت۔ علاقائی حکمتِ عملی کی ناگزیر پکار: اس موضوع کے تحت ہجرت کی بنیادی وجوہات، قانونی چیلنجز اور پالیسی فریم ورک پر مدلل گفتگو کی گئی۔

☆ اس کانفرنس میں محترم چوہدری منظور احمد (رکن مرکزی عاملہ پاکستان پیپلز پارٹی اور سابق رکن قومی اسمبلی) نے بطور مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ انہوں نے اپنی گفتگو میں کہا کہ یہ کانفرنس

عصرِ حاضر کے اہم ترین عالمی مسائل پر سنجیدہ مکالمہ اور ٹھوس فکری رہنمائی فراہم کر رہی ہے۔ موسمیاتی تبدیلی، ہجرت اور غذائی تحفظ جیسے چیلنجز پر مشترکہ کوششوں کی ضرورت ہے۔ میں اس اقدام پر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری اور منہاج یونیورسٹی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

☆ پروفیسر ڈاکٹر خرم شہزاد (رجسٹرار منہاج یونیورسٹی) نے کانفرنس میں اختتامی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آج کا دن ہمیں اس حقیقت کا احساس دلاتا ہے کہ ہم ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں جہاں موسمیاتی تغیر، غیر قانونی ہجرت اور غذائی عدم تحفظ جیسے مسائل نے نوعِ انسان کو ایک کڑے امتحان سے دوچار کر رکھا ہے۔ آج ہم نے ان چیلنجز کا ادراک محض علمی گفتگو تک محدود نہیں رکھا، بلکہ ایک عزم و شعور کے ساتھ عمل کی جانب پیش قدمی کا عہد کیا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم بھوک کے خاتمے، موسمیاتی توازن اور باعزت و منصفانہ ہجرت کے خواب کو تعبیر دیں۔ آج ہم نے علم کے افق پر نئی راہیں تلاش کیں، تخلیقی فکر کی شمعیں روشن کیں اور بین الاقوامی تعاون کے باب رقم کیے۔ اب ہمیں چاہیے کہ ان خیالات کو عمل کی صورت میں ڈھالیں، اس علم کو بانٹیں، دوسروں کو شریکِ سفر بنائیں اور تبدیلی کی اس تحریک کو نئی جہت دیں۔

☆ کانفرنس کے اختتام پر پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری نے ”گلوبل سینٹر فار مائیگریشن اینڈ ڈویلپمنٹ“ کا باضابطہ افتتاح کیا۔ یہ مرکزِ تحقیق، پالیسی سازی اور مکالمے کو فروغ دے گا اور ہر سال کانفرنسز، تربیت اور اشاعتوں کے ذریعے علمی میدان میں گراں قدر خدمات انجام دے گا۔

یہ بین الاقوامی کانفرنس نہ صرف فکری وسعت کی ایک زندہ تصویر تھی بلکہ اس نئے عالمی شعور کی بنیاد بھی ہے، جو سرحدوں، رنگوں اور مذاہب سے بالاتر ہو کر صرف انسانیت کی فلاح کا داعی ہے۔

ACTIO
tion on Climate Action (SDG 13)
Hunger (SDG 2): A Way

Action (SDG 13), Irreg
A Way Forward

2nd IN
CLIMAT
ACTIO
School
A Way Forward

سانحہ ارتحال برادرِ اصغر شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

گزشتہ ماہ 10 مئی 2025ء بروز ہفتہ، شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے چھوٹے بھائی، انجینئر محمد طارق فرید قضائے الٰہی سے انتقال فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی نمازِ جنازہ ان کے آبائی علاقے بستی لوہلے شاہ، جھنگ صدر میں واقع دربار فریدِ ملتؒ کے احاطے میں ادا کی گئی۔ اس روح پرور موقع پر ہر آنکھ اشکبار اور ہر دل غمزدہ تھا۔ نمازِ جنازہ میں صاحبزادہ شیخ احمد مصطفیٰ العربی القادری نے خصوصی شرکت کی۔ ملک بھر سے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیات، علما، مشائخ، سیاسی و سماجی قائدین، اہلِ علاقہ اور تحریک منہاج القرآن کے رفقاء کی بڑی تعداد نے شرکت کی اور مرحوم کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی بلندیٔ درجات کے لیے خصوصی دعا کی۔ تحریک منہاج القرآن کی جملہ مرکزی قیادت نے ناظم اعلیٰ خرم نواز گنڈاپور کی قیادت میں نماز جنازہ میں شرکت کی اور جملہ مرکزی قائدین اور منہاج القرآن کے رفقاء نے مرحوم کے صاحبزادگان محترم عمران طارق، محترم عثمان طارق، محترم رضوان طارق اور دیگر رشتہ داروں سے اظہار تعزیت کیا اور ان کے لیے صبر جمیل اور اجر عظیم کی دعا کی۔

☆ بعد ازاں مرحوم محمد طارق فرید رحمۃ اللہ علیہ کے ایصال ثواب کے لیے 11 مئی 2025ء (اتوار) مرکزی جامع مسجد، پرانی عید گاہ جھنگ صدر میں ختمِ قل شریف اور دعائیہ تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس تقریب میں تلاوتِ قرآنِ حکیم کے بعد معروف ثناء خوانانِ مصطفیٰ ﷺ نے بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ نائب ناظم اعلیٰ تحریک منہاج القرآن علامہ رانا محمد ادریس قادری نے روحانی، اخلاقی اور اصلاحی خطاب کیا جس میں انہوں نے خدمتِ دین، اخلاص اور شیخ الاسلام سے مرحوم کی قلبی وابستگی کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

☆ مرحوم کی روح کے ایصالِ ثواب کے لیے مرکزی سیکرٹریٹ اور پاکستان سمیت دنیا بھر میں قائم منہاج القرآن اسلامک سنٹرز میں منہاج القرآن کی تنظیمات اور رفقاء کے زیر اہتمام ایصال

ثواب کی محافل کا خصوصی انعقاد کیا گیا جس میں رفقاء و کارکنان اور عامۃ الناس کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ قرآن خوانی اور محفل نعت کے بعد مقررین نے مرحوم کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا اور بلندئ درجات کی دعا کی۔

☆ مرحوم کے ایصالِ ثواب کی خصوصی محفل مانچسٹر، برطانیہ میں منعقد ہوئی۔ جس میں شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے خصوصی شرکت فرمائی۔ اس تقریب میں مانچسٹر اور گردونواح میں مقیم رفقاء و کارکنان اور عامۃ الناس نے شرکت کی جبکہ MQI لندن، بریڈفورڈ، برمنگھم، نیلسن، گلاسگو، ڈنڈی سمیت برطانیہ بھر کے MQI مراکز نے بذریعہ ویڈیو لنک شرکت کی۔ پروگرام میں علمائے کرام، رفقاء و وابستگانِ تحریک، سیاسی و سماجی رہنما، اراکینِ پارلیمنٹ اور ممتاز کمیونٹی شخصیات نے شرکت کر کے مرحوم کی بلندئ درجات کے لیے دعائیں کیں اور ان کی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس موقع پر شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے موت کے اسرار و رموز پر قرآن و سنت کی روشنی میں بصیرت افروز خطاب فرمایا اور اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ گزرے ہوئے خوشگوار لمحات اور اُن کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

☆ مختلف قومی و بین الاقوامی شخصیات نے شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری سے اس سانحہ پر اظہارِ تعزیت کیا اور مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی۔

انجینئر محمد طارق فرید قادری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات منہاج القرآن کے وابستگان، ان کے خاندان اور تمام اہلِ محبت کے لیے ایک گہرے دکھ کا باعث ہے۔ ان کی خدمات، خلوص، اخلاص، شیخ الاسلام سے محبت اور مصطفوی مشن سے قلبی وابستگی رہتی دنیا تک یاد رکھی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے، ان کے درجات بلند فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے برادر عزیز

محترم انجینئر محمد طارق فرید قادری رحمۃ اللہ علیہ کا انتقالِ پرملال

Monthly
MINHAJ-UL-QURAN
JUN-2025
LAHORE
Regd CPL No.41

علمی و عملی، اخلاقی و روحانی، تعلیمی و سائنسی،
فقہی و قانونی، انقلابی اور فکری و عصری
موضوعات پر شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی
650 سے زائد کتب دستیاب ہیں